سوانح قاسمی

یعنی

سیرت شمس الاسلام

سیدنا الامام الکبیر حضرت مولانا محمد قاسم النانوتوی قدس سرہٗ

حصہ دوم حصہ سوم

رئیس القلم حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ تعالیٰ

مکتبہ رحمانیہ
اقرا سنٹر، غزنی سٹریٹ
اردو بازار، لاہور

488
500, 508,
510
513

(93) سنگ رسوم ـ نانوتوی

(94) پنڈت کو مناظرہ کی دعوت

(95) انگریز مجسٹریٹ نانوتوی سے اچھی طرح پیش آیا۔

(96) نانوتوی کی سن وفات ہجری۔

سوانح قاسمی

یعنی

سیرت شمس الاسلام

سیدنا الامام الکبیر حضرت مولانا محمد قاسم النانوتوی قدس سرہٗ

حصہ دوم

رئیس القلم حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ
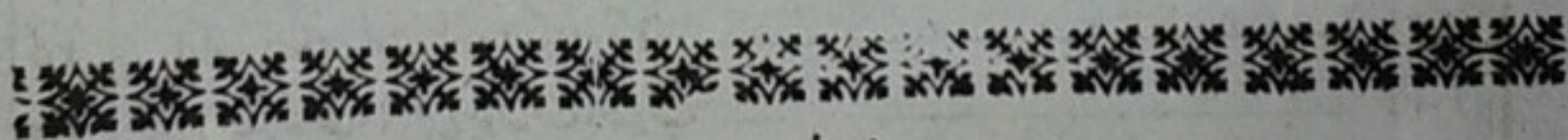
ناشر

مکتبہ رحمانیہ ۞ اردو بازار ۞ لاہور

دشمن آں باید بود کہ ادنیٰ مراتب نہی منکر ہمیں ست ص۱۳۰ وصیت نامہ | اور اس کا دشمن بن جانا چاہئے کہ بری بات کے انسداد کا یہی آخری درجہ ہے۔

میں نے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب سے ان کی پوری عبارت اسی لئے نقل کی ہے کہ اس رسم بد کی گرفت کی سختی جس حد تک ہندوستان کے مسلمانوں میں پہنچ چکی تھی، اس کو ان کے مذکورہ بالا الفاظ سے ہم سمجھ سکیں، ان کا دل تڑپ رہا تھا چاہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کو اس کے ترک پر آمادہ کریں۔ لیکن حالات ان کے سامنے ایسے تھے کہ بظاہر کامیابی سے کچھ ناامید نظر آتے ہیں اسی لئے آخر میں دل سے برا جاننے کی آخری تدبیر کے استعمال تک وہ اتر آئے ہیں، اور اسی سے امیر شاہ خان مرحوم کی ان روائتوں کی بھی تصدیق ہوتی ہے، جنھیں مسئلہ عقد بیوگان کے سلسلہ میں ہم ارواح ثلاثہ میں پاتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی نانیہال قصبہ پھلت کے مستند بزرگوں کے حوالہ سے امیر شاہ خاں یہ روایت کرتے تھے کہ مولانا اسماعیل شہید جیسا کہ معلوم ہے حضرت شاہ ولی اللہ کے پوتے ہیں، مولانا شہید کی ہمشیرہ کا عقد گھرہی میں مولانا رفیع الدین ابن شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے مولوی عبدالرحمن صاحب سے ہوا تھا، لیکن کچھ ہی دن بعد مولوی عبدالرحمٰن صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اور مولٰنا اسماعیل شہید کی ہمشیرہ صاحبہ بیوہ ہوگئیں، اب سنئے خود شاہ ولی اللہ کے گھرانے کا یہ قصہ ہے، مولانا اسمٰعیل کا یہ بیان امیر شاہ خان نے نقل کیا ہے کہتے تھے کہ

"جب میں اپنی بہن کو مشکوٰۃ وغیرہ پڑھاتا تھا، تو نکاح ثانی کے فضائل قصداً چھوڑ دیتا تھا کہ مبادا میری بہن کو ترغیب ہو، اور وہ نکاح کرلے" ص۶۹ ارواح

عقد بیوگان کے مسئلہ میں خانوادہ ولی اللہی کے احساسات کی نزاکتوں کا یہ حال تھا، تو اسی سے سمجھنا چاہئے کہ ہندوستان کے عام مسلمانوں کی ذہنیت اس باب میں کیا رہی ہوگی، یا کیا ہوسکتی تھی۔

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کراہتے ہوئے دل کی دعا قبول ہوئی اور

حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اس رحمت کے مستحق ہوئے جس کی دعا شاہ صاحب نے مانگی تھی، یہ قصہ کافی طویل ہے، سیرت سید احمد شہید میں اس کی تفصیلات پڑھئے، امیر شاہ خان کہا کرتے تھے کہ مولانا اسماعیل شہید سے کسی نے پوچھا کہ اپنے چچا شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر سے زیادہ سید احمد صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ سے گرویدگی کی وجہ آپ کیلئے کیا ہوئی؟ تو جواب میں اسی کا حوالہ دیا کہ ان کی صحبت میں یہ جرأت مجھ میں پیدا ہوئی کہ اپنی بیوہ بہن کا عقد زور دے کر میں نے خود کرا دیا۔ جس کی تفصیل خاں صاحب ہی یہ بیان کرتے تھے کہ پھلت میں "عقد بیوگان" کی طرف مسلمانوں کو ایک دن بر سر منبر مولانا اسماعیل شہید توجہ دلا رہے تھے کہ مجمع میں کسی نے عرض کیا کہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں، مولانا شہید سمجھ گئے، اور منبر سے اتر گئے، فرمایا کہ جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو، پھر پوچھنا، یہ کہتے ہوئے سیدھے پھلت سے دلی پہنچے، اور اپنی بیوہ بہن کے قدموں پر عمامہ ڈال دیا، اور گڑ گڑا کر عرض کرنے لگے کہ

"تم چاہو، تو میں وعظ کہہ سکتا ہوں، ورنہ نہیں کہہ سکتا"۔

وہ بے چاری حیران تھیں کہ قصہ کیا ہے تب کھلے کہ تمہارے عقد نہ کرنے کی وجہ سے میری دعوت بے اثر ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ مولانا شہید کی ہمشیرہ صاحبہ حالانکہ بیمار تھیں، اور نکاح کی صلاحیت بھی ان میں باقی نہیں رہی تھی، لیکن بھائی کے اصرار سے راضی ہو گئیں، اور پھلت ہی کے مشہور عالم سید شہید کے رفیق مخلص مولانا عبدالحئی سے ان کا نکاح کر دیا گیا[1]۔ واللہ اعلم بالصواب، امیر شاہ صاحب کا یہ علم تھا، یا واقعہ یہی تھا کہا کرتے تھے کہ ہندوستان میں

"مولوی اسماعیل صاحب کی بہن کا نکاح ثانی سب سے پہلا نکاح ثانی تھا"۔ ص ۶۸

بظاہر اس کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ عقد بیوگان کی تحریک کا آغاز حضرت سید شہید اور ان کے رفقاء کی طرف سے ملک میں جب شروع ہوا تو اس سلسلہ میں مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ہمشیرہ صاحبہ کا

---

[1] بعینہ یہی صورت حال حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ کو بھی پیش آئی ہے اور انہوں نے بھی اپنی بڑی بہن کا نکاح اسی طرح کر کے اس دعوت (نکاح بیوگان) میں قوت پیدا کی تھی۔ (محمد طیب غفرلہ)

عقد ثانی پہلا عقد ثانی تھا۔ گویا اس رسم بد کے ازالہ کے سلسلے میں یہ پہلا تاریخی نمونہ تھا۔

ارواح ثلاثہ وغیرہ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سید شہید رحمۃ اللہ علیہ کے زیر اثر علماء کا ایک طبقہ عقد بیوگان کی کوششوں میں ہمہ تن اور مشغول ہو گیا تھا، کوئی بے چارے مولوی عبدالرحیم صاحب تھے وہ تو "رانڈوں کی شادی والے" مولوی کے نام ہی سے مشہور ہو گئے تھے (دیکھو ارواح ثلاثہ ص۲) اس سلسلہ میں مولوی محبوب علی دہلوی مرحوم کا نام بھی خاص طور پر لیا جاتا ہے[1] مگر با ایں ہمہ نسلاً بعد نسل کی راسخ رسم جو دلوں کی گہرائیوں میں پشتہا پشت سے جاگزیں تھی، اس کی جڑوں کا نکالنا آسان نہ تھا، اور تو اور یہی دیوبند کا قصبہ جہاں آج دار العلوم ہے، اسی کا ایک قصہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اسی سلسلہ میں نقل کیا ہے، لکھا ہے کہ پھلت کے ایک عالم باعمل مولانا وحید الدین مرحوم تھے، وعظ ان کا عام طور پر مقبول تھا، خصوصیت کے ساتھ دیوبند کے شیخ زادوں میں غیر معمولی احترام کے ساتھ دیکھے جاتے تھے، ان کی اصلاحی باتیں عموماً لوگ مان لیتے تھے۔ ایک دن دیوبند ہی میں وعظ کہتے ہوئے، مولوی وحید الدین بے چارے نے عقد بیوگان کے مسئلہ کا ذکر بھی چھیڑ دیا، کہتے ہیں کہ ابھی تمہید ہی شروع ہوئی تھی، کہ مجلس سے قصبہ کے ایک رئیس شیخ زادے صاحب اٹھ کھڑے ہوئے، اور منبر کے پاس بے ساختہ دوڑتے ہوئے پہنچے، مولوی صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا، اور بر سر مجلس ڈانٹتے ہوئے بولے کہ

"بس مولوی صاحب اس مضمون کو مت بیان کرو"۔ عنہ

---

[1] ابتداء میں حضرت سید شہید کی جہادی مہم میں یہ بھی شریک تھے۔ لیکن بعد میں اپنے بعض اختلافی نقاط نظر کی وجہ سے دہلی واپس آ گئے تھے، ارواح ثلاثہ میں ان ہی کے کردار کے ایک غیر معمولی نمونہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ غدر کے ہنگامہ میں کہتے ہیں کہ مولوی صاحب کا فتویٰ تھا کہ حکومت قائمہ کے خلاف شورش وبغاوت جائز نہیں ہے۔ جب ہنگامہ فرو ہوا تو اپنے اس فتوے کے صلہ میں انگریزی حکومت کی طرف سے گیارہ گاؤں کا وثیقہ پیش ہوا، کہ تمہاری جاگیر میں حکومت کی طرف سے عطا ہوئے ہیں۔ لکھا ہے کہ وثیقہ کو لے کر اسی انگریز افسر کے سامنے مولوی صاحب نے پھاڑ دیا۔ جس نے وثیقہ پیش کیا تھا، غصہ میں کہہ رہے تھے کہ میں نے جو کچھ کیا تمہارے لئے نہیں کیا تھا، بلکہ میرے نزدیک مسئلہ کی شکل ہی وہی تھی۔ ص۳۹ ارواح

ظاہر ہے کہ جہاں گفتار کردار کا قالب ان شکلوں میں اختیار کر رہا تھا، وہاں اگر یہ صورت پیش آئی ہو، جیسا کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف کا بیان ہے کہ

"پھر تو اس دھوم دھام سے نکاح (ثانی) ہونے لگے، جیسے کنواری لڑکیوں کے"

ہمارے مصنف امام نے سیدنا الامام الکبیر کے متعلق جو یہ خبر دی تھی کہ "عقد بیوگان کی عام اشاعت ان ہی کی بدولت ہوئی۔ اس کا مطلب یہی تھا، کہ عزت و ناموس کے منافی بیوہ عورتوں کے عقد کو جو عموماً سمجھا جاتا تھا، اس غلط ظالمانہ خیال کا ازالہ ہو گیا، بقول مصنف سوانح مخطوطہ

"یہ تو نہیں کہ سب بیواؤں کا نکاح ہو گیا، مگر جو روگ دل کے اندر تھا کہ نکاح ثانی کو ننگ کٹی، اور شرافت کے خلاف سمجھتے تھے وہ دور ہو گیا، اور عیب نہ رہا" ص۴۴

اس میں شک نہیں کہ بیان کرنے والوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ بیان کیا ہے، زیادہ تر اس کا تعلق اسی علاقہ کے مسلمانوں سے ہے، جس میں سیدنا الامام الکبیر نے اپنی تحریک جاری کی تھی، لیکن دارالعلوم دیوبند کے قائم ہو جانے کے بعد سارے ہندوستان میں پڑھ پڑھ کر علماء جو پھیلے، آگے ان کی اور ان کے زیر اثر شخصیتوں کی بدولت ہمارے زمانے تک عقد بیوگان کے رواج میں کافی وسعت پیدا ہو چکی ہے[1]۔

---

[1] میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں اس رسم بد کے ازالہ میں جو کچھ کام ہوا، براہ راست دارالعلوم دیوبند اور ان کے ہم خیالوں ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے، بلکہ حضرت سید شہید کے ماننے والوں میں ایک طبقہ اہل حدیث کا جو پیدا ہو گیا تھا، اس کی طرف سے بھی کافی جد و جہد ہوئی۔ مولانا حالی کی مشہور نظم بیوہ کی مناجات وغیرہ کا بھی کافی اثر پڑا۔ عجیب بات ہے کہ مسلمان تو مسلمان پچھلے دنوں خود ہندوؤں میں بعض لوگ "بدھوا بواہ" کی تحریک کو لے کر کھڑے ہوئے اور گو مسلمانوں کی جیسی کامیابی تو ان کو نہیں ہوئی ہے۔ لیکن قدرت کا پھر بھی یہ تماشا ہی ہے کہ جن کو دیکھ کر مسلمان اس مسئلہ میں بگڑے تھے، خود ان ہی میں اس ظالمانہ رسم کے خلاف تجویزیں سوچی جانے لگیں، اور تھوڑا بہت عمل بھی ہونے لگا۔ بہر حال اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دارالعلوم دیوبند اور اس کے زیر اثر حلقوں کا بھی اس اصلاح میں غیر معمولی حصہ ہے۔ بہار کے جس علاقہ میں خاکسار کا وطن ہے، یعنی ضلع پٹنہ کا شرقی علاقہ جسے مگدیا مگدہ بھی کہتے ہیں، جہاں تک میں جانتا ہوں اس علاقہ کی سادات برادری میں سب سے پہلے موضع دسنہ جو مولانا سید سلیمان ندوی کا مولد و منشاء ہے۔ اسی گاؤں کے ایک بزرگ حافظ تجمل حسین مرحوم نے (باقی صفحہ ۱۶ پر)

تو جیسے "عقد بیوگان" کے قولی وعظ کے ساتھ آپ کا عملی نمونہ اثر انداز ہوا۔ اسی طرح وراثت کے باب میں بھی آپ کے طریقۂ عمل کی پیروی لوگ کیوں نہ کرتے۔

بہر حال داخلی اصلاحات کے سلسلے میں جیسے عقد بیوگان کے مسئلہ میں سیدنا الامام الکبیر خانوادہ ولی اللٰہی کے تقاضے سے متاثر تھے اور ولی اللٰہی طریقہ کے بزرگوں ہی کے کام کی آپ نے تکمیل فرمائی تھی، اسی طرح جیسا کہ چاہیے بھی تھا دوسرے شعبوں میں بھی اسی خاندان کے دینی احساسات سے آپ کی اثر پذیری ایک قدرتی بات تھی، اسی خاندان کے تعلیم یافتہ بزرگوں کے حلقہ میں آپ کی علمی اور عملی صلاحیتیں بر روئے کار آئی تھیں، قلب مبارک خانوادۂ ولی اللٰہی کے اکابر کی عظمت و احترام سے معمور تھا خود شاہ صاحب رحمۃ اللہ کا اور آپ کے تینوں صاحبزادوں، مولانا شاہ عبد العزیز مولانا شاہ عبد القادر مولانا رفیع الدین کا ذکر جس غیر معمولی عقیدت و ادب کے ساتھ آپ کیا کرتے تھے۔ اسی سے آپ کے دل کی کیفیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اپنی کتاب ہدیۃ الشیعہ میں شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کا نام جہاں کہیں آپ نے لیا ہے، وہاں

"حجۃ اللہ فی العالمین، خاتم المحدثین والمفسرین عمدۃ المتکلمین، زبدۃ المناظرین مولانا شاہ عبد العزیز علیہ الرحمۃ۔" ص۴

یا قریب قریب اسی قسم کے الفاظ بے ساختہ آپ کے قلم سے نکلتے چلے گئے ہیں اور یہی حال ان کا دوسرے بھائیوں کے متعلق تھا۔ بقول امیر شاہ خان مرحوم جیسا کہ ارواح ثلاثہ میں ہے واقعہ یہ ہے کہ

"ولی اللٰہی خاندان کے ایک ایک فرد سے محبت اور فدائیت تھی۔" ص۱۷۷

لیکن ان ولی اللٰہی بزرگوں میں آپ کی خصوصی محبت و عقیدت کا مرکزی محور جیسا کہ دیکھنے والوں نے نقل کیا ہے، حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی مبارک ہستی تھی، امیر شاہ خان مرحوم تو کہا کرتے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر کو

"مولانا شہید سے عشق تھا۔" ص۱۷۷

اور مشہور قاعدہ من احب شیئاً اکثر ذکرہ (جس چیز سے آدمی کو محبت ہوتی ہے اس کا ذکر بھی وہ زیادہ کرتا ہے) کو پیش نظر رکھتے ہوئے عشق کے اس دعوے کے ثبوت میں خان صاحب مرحوم حضرت والا کی اس عادت کا بھی تذکرہ کیا کرتے تھے کہتے تھے کہ حضرت نانوتوی کا حال یہ تھا کہ مولانا اسماعیل شہید کا آپ کی مجلس میں اگر

"کسی نے تذکرہ چھیڑا تو اس کی بات کاٹ کر خود ان کا تذکرہ شروع کر دیتے تھے"

سچ پوچھئے تو مولانا شہید کی علمی و عملی خصوصیات کے سوا اس غیر معمولی تعلق میں جہاں تک میرا خیال ہے۔

قاعدہ ہست کہ الجنس الی الجنس یمیل

کا قانون بھی کار فرما تھا، سیدنا الامام الکبیر کی ابتدائی زندگی کے حالات میں یاد ہوگا کہ ایک سے زیادہ بزرگوں کو ایام طفولیت ہی میں علمی کمالات کے جلوے سیدنا الامام الکبیر کے طالع ارجمند میں چمکتے ہوئے نظر آئے تھے۔ خود آپ کے استاذ مولانا مملوک علی "ہمارے اسماعیل" کے لقب سے دونوں بزرگوں کی باہمی مناسبت "اور فطری تشابہ کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔

ایسی صورت میں مسلمانان ہند کے داخلی اصلاحات کی فہرست دونوں بزرگوں کی اگر ایک ہو تو یہی ہونا بھی چاہئے تھا، اور عام طور پر یہی کہا بھی جاتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے، کہ بعض نئے حالات اور مؤثرات نے جہاں تک میرا خیال ہے، اس مسئلہ کو سیدنا الامام الکبیر کے عہد میں زیادہ پیچیدہ اور دشوار بنا دیا تھا تفصیل کا تو موقعہ نہیں ہے۔ لیکن اجمالاً اتنی بات تو کھلی ہوئی ہے کہ غیر اسلامی عناصر چپکے چپکے مسلمانوں کی دینی زندگی میں صدیوں سے جذب ہوتے چلے جا رہے تھے، تا اینکہ ہندوستان میں پہنچکر وہی مکروہ و مہیب قالب سامنے آچکا تھا جسے دیکھ کر بے ساختہ سیدنا الامام الکبیر یہ فرمانے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ

"کس منہ سے ہندوؤں کو برا اور اپنے آپ کو بھلا کہہ سکتے ہیں"! مثہ فیوض قاسمیہ

دراصل یہی مسئلہ "سنت و بدعت" کا تھا اور کوئی شبہ نہیں کہ

اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ	آگاہ ہو کہ اللہ ہی کے لئے ہے دین خالص

کے قرآنی نصب العین کی طرف واپس لے جانے کے لئے بیرونی آلائشوں سے مسلمانوں کے دین کو پاک کرنے کا سلسلہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ سے جو شروع ہوا تھا۔ تطہیر و تزکیہ کا یہ کاروبار بہ تدریج آگے ہی بڑھتا چلا جارہا تھا حضرت مجدد کے بعد خانوادہ ولی اللہی نے اس راہ میں غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ تا اینکہ حضرت مولانا اسماعیل شہید نے اپنے شیخ طریقت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں اس تحریک کو "ہمہ گیر تحریک" بنادیا۔ سنت و بدعت کی کشمکش کے ان ہی دنوں میں یورپ کی ایک ایسی عیسائی قوم کی حکومت ملک پر قائم ہو گئی، جو صلیبی دین کے قدیم کلیسائی نظام کی تقلید کا جوا اپنی گردن سے اتار چکی تھی، بلکہ ایک طبقہ ان کا مذہبی مسلمات کے متعلق غیر معمولی طور پر بے باک ہو چکا تھا، اسی زمانہ میں مسلمانوں کے بعض ممالک میں بھی یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ اگلی نسلوں کے دین پر اعتماد کر کے پچھلی نسلیں جن باتوں کو مانتی چلی آرہی ہیں ضرورت ہے کہ ان پر تنقید کی جائے۔ خصوصاً عرب جو مسلمانوں کا دینی مرکز ہے، اس تحریک کا وزن اسی کے بعض خاص علاقوں پر غیر معمولی طور پر پڑ رہا تھا۔ نجد کے باشندے، اور اسی علاقہ کے ایک عالم محمد بن عبد الوہاب اس تحریک کے سب سے بڑے علم بردار تھے۔

یہی پیچ در پیچ تاثیری اسباب تھے جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ سید شہید جس جماعت کو چھوڑ کر "احیاء عند ربھم یرزقون" کی قدوسی صف میں شریک ہوئے تھے۔ اس جماعت کے بعض افراد تطہیر و تزکیہ کے اس عمل میں حدود سے تجاوز کرنے لگے۔ سڑے ہوئے گوشت کے ساتھ زندہ گوشت پر بھی عمل جراحی کرنے لگے، بے احتیاطیاں اس حد تک ترقی کر کے پہنچ چکی تھیں کہ مسلمانوں کی دینی زندگی کی شرائین اور شہ رگ تک کو نشتر زنی کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں، اور بقول سیدنا الامام الکبیر

"علماء و فقراء جن کو خلاصۂ امت کہئے" ہدیہ فیوض قاسمیہ

اسی خلاصہ امت کو اپنے عمل جراحی کا تختۂ مشق ان لوگوں نے چاہا کہ بنالیا جائے۔ گویا اسلام

مودا اکراما"، اور احادیث منع نزاع مانع ہیں" مے

حلم و تحمل، صبر و ثبات کے جبلی جذبات کا سیدنا الامام الکبیر کے خیال کیجئے اور پھر سوچئے کہ دماغی کوفت کی وہ کیا کیفیت ہوگی، جس نے ان الفاظ کے لکھنے پر آپ کو مجبور کیا۔

اپنے اساتذہ حضرت شیخ الہند اور مولانا عثمانی مولٰنا کشمیری رحمۃ اللہ علیہم کی زبانی اسی سلسلہ میں بعض لطیفے حضرت والا کے فقیر نے سنے ہیں، جن میں ایک مشہور لطیفہ یہ بھی ہے جو فرقہ اہلحدیث کے سرگرم رکن مولوی محمد حسین بٹالوی کے سوال کے جواب میں حضرت والا نے ارقام فرمایا ہے۔ بہرحال لطیفہ یہ سننے میں آیا ہے کہ مولوی محمد حسین صاحب نے (حضرت والا کو لکھا کہ مجھے تنہائی میں آپ سے بعض مسائل میں گفتگو کرنی ہے مگر شرط یہ ہے کہ آپ کا کوئی شاگرد بھی وہاں موجود نہ ہو۔ حضرت نے منظور فرما کر جواب تحریر فرمایا کہ تشریف لے آئیں۔ محمد طیب) چنانچہ مولانا موصوف حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھر وہی عرض کیا کہ تنہائی میں آپ سے کچھ باتیں کرنی چاہتا ہوں اجازت دے دی گئی،

جہاں تک یاد پڑتا ہے، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ ہی سے یہ بات فقیر نے سنی تھی، فرماتے تھے کہ حجرہ بند کر دیا گیا، ہم طلبہ باہر تھے۔ دونوں میں گفتگو ہونے لگی، ہماری طالب علمی کا زمانہ تھا، بے اختیار جی چاہا کہ اس گفتگو کو کسی طرح سننا چاہئے (میں اسی دروازہ سے لگ کر بیٹھ گیا جس کے متصل ہی اندر یہ حضرات بیٹھے تھے، حضرت والا نے مولانا سے فرمایا کہ دیکھئے جس مسئلہ میں بھی گفتگو فرمانی ہو، اُس میں دو باتوں کا خیال رکھئے۔ ایک یہ کہ مسئلہ زیر بحث میں حنفیہ کا مذہب بیان فرمانا آپ کا کام ہوگا اور دلائل بیان کرنا میرا کام ہوگا۔ دوسرے یہ کہ میں مقلد امام ابوحنیفہ کا ہوں، اس لئے میرے مقابلہ میں آپ جو قول بھی بطور معارضہ پیش کریں وہ امام ہی کا ہونا چاہئے۔ یہ بات مجھ پر حجت نہ ہوگی کہ شامی نے یہ لکھا ہے اور صاحب درمختار نے یہ فرمایا ہے، میں اُن کا مقلد نہیں۔ چنانچہ فاتحہ خلف الامام، رفع یدین آمین بالجہر وغیرہ بہت سے مختلف فیہ مسائل زیر گفتگو آئے اور حسب شرائط طے شدہ مولانا محمد حسین صاحب مذہب احناف

بیان فرماتے اور حضرت والا دلائل سے اسے ثابت کرتے حضرت کی تقریروں کے درمیان مولانا محمد حسین صاحب جھوم جھوم جاتے اور بعض اوقات تو جوش میں سبحان اللہ کہتے کہتے کھڑے ہونے کے قریب ہو جاتے۔ جب گفتگو ختم ہو چکی تو (محمد طیب) مولوی محمد حسین صاحب کی زبان سے بے ساختہ یہ فقرہ نکلا کہ

"مجھے تعجب ہے کہ آپ جیسا شخص اور مقلد ہو (یعنی باایں زور علم و فراست و قوت استنباط تقلید کے کیا معنی؟)"

جواب میں حضرت شیخ الہند کہتے تھے میں نے سنا حضرت والا ارشاد فرما رہے ہیں،

"اور مجھے تعجب ہے کہ آپ جیسا شخص اور غیر مقلد ہو۔ (یعنی مدعی اجتہاد ہو)"

اسی طرح "خلاصہ است" کے دوسرے رکن "فقراء" کے طرز عمل اور طریق زندگی، ان کے خاص مشاغل اور احساسات و وجدانات، جن کی اجمالی تعبیر "تصوف" سے کی جاتی ہے، ملاؤں کی یہ ٹولی اس طبقہ پر جن حرف گیریوں اور نکتہ چینیوں سے کام لیکر غلط کے ساتھ صحیح عناصر کو بھی ملیامیٹ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ گھن کے ساتھ گیہوں کو بھی دینی بصیرت سے محرومی کی وجہ سے پیس رہی تھی۔ گویا دین کی روح ہی کے قبض کرنے کی فکر میں مشغول تھی۔ سیدنا الامام الکبیر اس طبقہ کے ان رجحانات سے بھی غیر معمولی طور پر متاثر تھے۔ اپنی بعض تحریروں میں بڑی دلسوزیوں کے ساتھ اسی سلسلہ میں "سنت و بدعت" کی صحیح حدود کو سمجھانے کی آپ نے کوشش کی ہے حکیم ضیاء الدین مرحوم (رامپور منہیاران والے) کے نام مطبوعہ مکتوب فیوض قاسمیہ کے مجموعہ میں جو شریک ہے، ہے تو چند صفحات ہی کا یہ خط لیکن "سنت و بدعت" کے متعلق جتنی بڑی چھوٹی کتابیں کم از کم فقیر کی نظر سے گذری ہیں، میرا احساس تو یہی ہے کہ شاید اتنی "جامعیت" کے ساتھ مسئلہ کا تصفیہ کسی ایک کتاب میں مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔ اسی میں منجملہ دوسری باتوں کے یہ سمجھاتے ہوئے کہ

"علاج میں بعض ایسے امور ہوتے ہیں، بعض اوقات وہ ضمناً اور عرضاً مامور بہ ہوتے ہیں

یا یہ عقیدہ بلا شبہ بدعت بن جائے گا۔ خود سیدنا الامام الکبیر نے یہی لکھا ہے کہ

"اگر ان امور کو کوئی مقصود بالذات سمجھ بیٹھے، تو ظاہر ہے کہ اس وقت ان کی بجا آوری بوجہ ذریعہ ہونے امور مسنونہ کے نہیں، تو اس وقت میں یہ ہی امور مامور بہ نہ رہیں گے۔"

اسی کے بعد فرماتے ہیں کہ

"تو اب لاریب یہ سب امور بدعت ہو جائیں گے۔"

اسی کے ساتھ آپ نے یہ بھی ارقام فرمایا ہے کہ شرعی مطالبات کی تکمیل کی صورت اگر ان امور کے بغیر کسی وجہ سے کسی کے لئے ممکن ہو جائے تو فرماتے ہیں کہ اس کی مثال یہ ہوگی کہ

"شربت بنفشہ کہیں تیار مل جائے تو پھر وہ امور جن کو ذریعہ تحصیل شربت بنفشہ قرار دیا ہے، مامور بہ نہ رہے۔"

اور جیسے صوفیہ کے بعض مشاغل جن کا صراحۃً ذکر کتاب و سنت میں نہیں ملتا، لیکن امور مطلوبہ جیسا کہ خود ہی فرماتے ہیں کہ مثلاً

"توجہ الی اللہ، اور تحصیل محبت خداوندی، اور قلع قمع محبت دنیا اور اہل دنیا اور تہذیب اخلاق و ازالہ خصال ناشائستہ۔"

ان امور کے حصول میں ان مشاغل سے مدد ملتی ہے، اور بقول ان ہی کے

"اہل عقل و تجربہ کاروں پر پوشیدہ نہیں کہ امور مذکورۃ الصدر کو بیشک ان مقاصد کے حصول میں مداخلت تام ہے۔ اس لئے ضمناً اور عرضاً مامور بہ ہوئے۔"

اسی طرح ابتداء مکتوب میں اس قسم کی چیزوں کا مثالاً آپ نے ذکر فرمایا ہے کہ

"کون نہیں جانتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ کلام اللہ اس طرح من اولہ الی آخرہ اوراق میں لکھا ہوا تھا، نہ اس میں اس زمانہ تک زیر زبر تشدید جزم ایجاد ہوئے تھے، نہ کتب احادیث یوں تصنیف ہوئیں، نہ تدوین کتب فقہ و اصول فقہ

اور تفسیر کا دستور تھا"

طبقۂ علماء کی مذکورہ بالا خدمات یا اسی نوعیت کی جو دوسری چیزیں ہیں سب کو آپ نے اسی مد میں شمار فرمایا ہے جو ضمناً اور عرضاً مامور بہ ہیں یعنی شریعت کے مطالبات کی تکمیل میں معاون و ممد ہیں۔

اسی سلسلہ کا ایک حکیمانہ فیصلہ سیدنا الامام الکبیر کا وہ بھی ہے، جسے آپ کی کتابوں میں تو میں نے نہیں پایا ہے[1]، لیکن آپ کے خلف رشید مولانا حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حیدرآباد کی ایک مجلس میں اس کا تذکرہ فرمایا تھا، خاکسار بھی اس مجلس میں شریک تھا، جی چاہتا ہے کہ اسے یہاں درج کردوں۔ حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت والا کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ شرعی مطالبات کو دو حصوں میں تقسیم کرکے فرمایا کرتے تھے کہ ایک حصہ تو ان مطالبات کا ایسا ہے، جس کی روح اور قالب یا معنی اور صورت دونوں ہی کو شریعت نے متعین کر دیا ہے۔ مثلاً نماز کا جو حال ہے کہ روح اس کی ذکر اللہ ہے ۔ اقم الصلوٰۃ لذکری (قائم کرو نماز کو میری یاد کیلئے) شریعت نے اس کی تصریح بھی کی ہے، اور اسی کے ساتھ نماز کے قالب اور ظاہری صورت کو بھی متعین کر دیا ہے، یعنی ہر رکعت میں قیام کے ساتھ طے کر دیا گیا ہے کہ ایک رکوع دو سجدے ہوں، وغیرہ وغیرہ، پس اس قسم کے مطالبات میں تو روح اور معنی کے ساتھ شرعی مطالبات کی ظاہری شکل وصورت میں بھی کسی قسم کی ترمیم، یا اضافہ کا حق کسی کو نہیں ہے، اسی کے مقابلہ میں شرعی مطالبات ہی کی ایک قسم ایسی بھی ہے، کہ اصل مقصد اور روح کا مطالبہ کرکے قالب اور شکل وصورت کے متعلق آزادی بخشی گئی ہے۔ مثلاً جہاد ہی کے حکم کو لیجئے، اعلاء کلمۃ اللہ اور کفر کی شوکت و قوت کا ازالہ اس حکم کی روح ہے، لیکن شریعت نے اس کا پابند لوگوں کو نہیں بنایا ہے کہ اس حکم کی تعمیل کا خاص قالب کیا اختیار کیا جائے، عہد نبوت میں صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جہاد کے فرض کو تلوار

---

[1] سنت و بدعت کے بارہ میں اس حکیمانہ فیصلہ کی تفصیلات اور متعلقہ لطیف مباحث مصباح التراویح میں موجود ہیں جو شوق رکھتے ہوں اس میں مطالعہ فرمائیں۔ محمد طیب غفرلہ

اور برچھے، ڈھال، تیر و کمان وغیرہ آلات کے ذرائع کو اختیار کر کے ادا کرتے تھے، لیکن موجودہ زمانہ میں جنگ کے آلات بدل گئے ہیں، آج کل توپ بندوق نئے آلات حرب استعمال ہونے لگے ہیں پس جہاد کے حکم کی تعمیل کی سعادت ان جدید آلات حرب کو استعمال کر کے جو حاصل کرے گا یقیناً شریعت ہی کے مطالبہ کی وہ تعمیل کر رہا ہے، اس پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ جہاد میں خلاف سنون چیزوں کا استعمال کر رہا ہے، اور بجائے سنت کے وہ بدعت کا مرتکب ہے۔

برسوں کی سنی ہوئی بات ہے، جہاں تک حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر سے بات سمجھ میں آئی تھی، اپنے الفاظ میں میں نے اس کو ادا کر دیا ہے۔ کچھ بھی ہو جو بھی تھوڑی بہت سمجھ رکھتا ہے، وہ حضرت والا کی مذکورہ بالا تقسیم کی واقعیت کا انکار نہیں کر سکتا، میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ جہاد کا جو حال ہے، تقریباً کچھ یہی صورت ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں ذکر اللہ کی بھی نظر آتی ہے۔ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبہم (یعنی کھڑے بیٹھے لیٹے) ہر حال میں ذکر اللہ کو مشغلہ بنانے والوں کی قرآن میں تعریف کی گئی ہے، اللہ کے ذکر کا حکم بھی دیا گیا ہے، اور اسم اللہ کے ذکر کا مطالبہ بھی قرآن ہی میں پایا جاتا ہے، لیکن ان ذکری مطالبات کی تعمیل کا کوئی خاص قالب نماز وغیرہ مطالبات کی طرح شریعت نے مقرر نہیں کیا ہے، پس جہاد کے حکم کی تعمیل حالات اور وقت و زمانہ کے لحاظ سے جس شکل میں بھی کی جائے گی، جیسے وہ شرعی مطالبہ ہی کی تعمیل ہے، اسی طرح صوفیہ کرام رحمۃ اللہ علیہم نے حالات کے لحاظ سے جو قالب اور جو شکل بھی ذکر اللہ کے لئے جس زمانہ میں بھی اختیار کی ان کے اس طرز عمل کے متعلق یہ سوال کہ شریعت میں ان خاص طریقوں کا پتہ نہیں چلتا خود ہی سوچئے کہ کیا صحیح دینی بصیرت کا یہی تقاضا ہے؟

بہر حال سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے مسلمانوں کی دینی زندگی کی تطہیر و تزکیہ کا کام تو بیک سوئی سے انجام پا رہا تھا، مقابلہ میں صرف وہی طبقہ تھا جو

ما وجدنا علیہ آباءنا الاولین | ہم نے اپنے پچھلے باپ دادوں کو اس پر نہیں پایا

کو حق و باطل کا معیار ٹھہراتے ہوئے اسی پر اصرار کر رہا تھا، لیکن تطہیر و تزکیہ کے اس اصلاحی

میدان میں سیدنا الامام الکبیر جس زمانہ میں اترے تو دوسری ٹولی مسلمانوں میں ان لوگوں کی پیدا ہو چکی تھی جو

ان ھذا الا اساطیر الاولین | یہ تو صرف پہلوں کی کہانیاں ہیں

کا حربہ بے دردی کے ساتھ ہر اس چیز پر بے محابا چلا رہی تھی جو اگلی نسلوں سے منتقل ہو کر پچھلی نسلوں تک پہنچی تھی، فقہ و تصوف کا سارا سرمایہ ان کے نزدیک

ان ھذا الا افک قدیم | یہ محض وہی پہلی بہتان بندی ہے -

سے زیادہ اور کوئی وقعت نہیں رکھتا تھا، لیکن ظاہر ہے کہ واقعی معیار حق و باطل کانہ آبائیت ہی کا اول الذکر مسلک ہے اور نہ انکیت کا آخر الذکر طریقہ، ایسی صورت میں اس شخص کا کام قدرتاً بہت زیادہ دشوار ہو جاتا ہے، جو ان دونوں مختلف ذہنیتوں کے اثر سے آزاد ہو کر حق و باطل کے واقعی معیار پر چیزوں کو پرکھنا چاہتا ہو، سچ پوچھئے تو کچھ اسی قسم کی صورت حال سے مسلمانوں کی داخلی اصلاحات کے سلسلہ میں سیدنا الامام الکبیر دوچار تھے، ان کی دینی بصیرت پا رہی تھی کہ ان دونوں متخالف ذہنیتوں کے نتائج میں سچ کے ساتھ کچھ جھوٹ اور جھوٹ کے ساتھ کچھ سچ بھی شریک ہے، جھگڑوں رگڑوں کے اس طوفانی ہنگامہ میں حق و باطل کے انبارے اصل حقیقت کو کھینچ کر باہر لانا، اور آدمی خود جو کچھ دیکھ رہا ہو دوسروں کو بھی دکھانا، خود سوچئے کہ یہ کتنا نازک کام ہے، لیکن اسی حد سے زیادہ نازک کام کو جہاں تک آپ کے امکان میں تھا کمال حزم اور غائت احتیاط کے ساتھ آپ انجام دیتے رہے، اسی سنت و بدعت والے مسئلہ میں یہ سمجھانے کے بعد کہ بہت سی باتیں جو بدعت نہیں ہیں،

"ان کو بدعت کہنا اپنا قصور فہم ہے"

لیکن احتیاط دیکھئے کہ صاف لفظوں میں ان امور پر "سنت" کے لفظ کے اطلاق کو بھی آپ پسند نہیں فرماتے، بلکہ مذکورہ بالا تفہیمی کوششوں کے بعد آخر میں لکھتے ہیں تو یہ لکھتے ہیں کہ

"ہاں بسبب اس کے کہ ظاہر شرع میں یہ ماموربہ نہیں، اس وجہ سے ان کو اگر

سنت نہ کہا جائے اور ملحق بالسنت کہا جائے تو مضائقہ نہیں'' ص۴۵ فیوض قاسمیہ

اسی زمانہ میں لوگوں نے ''سماع موتی'' کے پرانے مسئلہ کو پھر نئے سرے سے زندہ کرنا چاہا تھا، عام مسلمانوں کے قبری کاروبار کے ان قصوں کو دیکھ کر جن کے متعلق سیدنا الامام الکبیر کا یہ فقرہ نقل کر چکا ہوں کہ ''کس منہ سے ہندوؤں کو برا اور اپنے آپ کو بھلا کہہ سکتے ہیں'' بعضوں نے چاہا کہ موتی کے سماع ہی کا انکار کر دیا جائے۔ مطلب ان لوگوں کا یہ تھا کہ بنیادی اڈے ہی کو اڑا دیا جائے۔ نہ بانس رہے گا نہ بانسری بجے گی۔

پوچھنے والے نے سیدنا الامام الکبیر سے بھی اسی مسئلہ کو دریافت کیا۔ حضرت والا نے چند اوراق میں سوال کا جواب دیا ہے اور ''جمال قاسمی'' نامی مجموعہ مکاتیب میں یہ جواب شریک ہے، حاصل یہی ہے کہ سماع موتی کا آپ نے انکار نہیں فرمایا، لکھا ہے کہ جب

''قبرستان میں گذرے تو سلام سے دریغ نہ کرے، اور من پڑے تو ہدیہ مناسب وقت بھی پیش کرے، ورنہ سخت بے مروتی ہے، جو یوں آنکھیں چرائے چلا جائے'' ص۱

اور یہ تو خیر قول ہے، آپ کے تلمیذ سعید مولانا منصور علی خاں رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب میں آپ کے مسلک کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہوئے کہ

''بزرگوں کے مزار پر جایا کرتے، دعا کر کے چلے آتے''

آگے صراحۃً اپنی یہ شہادت قلم بند کی ہے کہ

''سماع اولیاء اللہ کے قائل تھے''

اور قائل ہی نہیں بلکہ آگے لکھتے ہیں کہ

''اگر اکیلے کسی مزار پر جاتے اور دوسرا شخص وہاں موجود نہ ہوتا، تو آواز سے عرض کرتے کہ آپ میرے واسطے دعا کریں'' ص۱۹۲

اسی سلسلہ میں حکیم صاحب مرحوم نے مکمل شاہ صاحب قدس اللہ سرہ کے مزار واقع مرادآباد کے اس قصہ کا بھی تذکرہ کیا ہے، جسے شاید کسی جگہ میں درج کر چکا ہوں، خلاصہ یہی ہے کہ

عمل شاہ صاحب کے مزار کے پاس ایک دفعہ حکیم صاحب نے دیکھا کہ سیدنا الامام الکبیرؒ تشریف فرما ہیں۔ حکیم صاحب بھی مزار کے قریب پہنچے اور بے خیالی میں ان کا پاؤں مزار شریف سے چھو گیا، حکیم صاحب کا بیان ہے کہ حضرت والا کو دیکھا کہ بے ساختہ دونوں ہاتھوں سے میرے پاؤں کو پکڑے ہوئے مزار سے الگ کر رہے ہیں، حکیم صاحب کہتے تھے کہ مجھ پر تو لرزہ طاری ہو گیا اور زمانہ تک اپنی اس جرأت بے جا پر دل نادم رہا۔

اور ایک حکیم صاحب ہی نہیں، مولانا طیب صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی یادداشت میں ارقام فرمایا ہے کہ حضرت نانوتوی

"اپنے بزرگوں سے میں نے یہ سنا ہے کہ کلیر شریف لے جاتے تو رڑکی سے پیدل، ننگے پاؤں ہو لیتے، اور شب کو روضہ میں داخل ہو کر کواڑ بند کر دیتے تھے، اور تمام رات حضرت صابر صاحب کے مزار پر تنہائی میں گذارتے تھے۔"

اسی یادداشت میں مولانا طیب صاحب نے مولانا منظور نعمانی مدیر الفرقان (لکھنؤ) کے حوالہ سے روایت بھی درج کی ہے کہ سنبھل سے مراد آباد جاتے ہوئے راستہ میں ایک جھاڑی کے اندر اینٹوں کا ڈھیر سا نظر آتا ہے۔ ایک دفعہ سیدنا الامام الکبیر اسی راہ سے بیل تانگے پر گذر رہے تھے، جوں ہی کہ تانگہ اس جھاڑی کے سامنے پہنچا، تانگہ کو رک جانے کا حکم دیا، اور اتر کر اینٹوں کے اس ڈھیر کے قریب پہنچے، مراقب ہو گئے، مراقبہ سے فارغ ہو کر تانگہ کی طرف جا رہے تھے اور زبان مبارک پر بے ساختہ یہ الفاظ جاری تھے

"اللہ اکبر بہت ہی جلالی آدمی ہیں۔"

مولانا منظور صاحب نے سنبھل کے رئیس نواب عاشق حسین صاحب سے یہ روایت سنی تھی، اس سفر میں حضرت والا کے ساتھ خود نواب صاحب موصوف اور ان کے ماموں منشی حمید الدین مرحوم تھے، جن کا شمار سیدنا الامام الکبیر کے عشاق میں ہے۔

اور سچی بات تو یہ ہے، جس شخص کے متعلق اس قسم کے مشاہدات و مکاشفات عام شہرت تک

پہنچے ہوئے ہوں۔ مثلاً امروہہ میں سادات کا جو خاندان شیخ اَبن کی اولاد میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن "شیخ" کے لفظ کی وجہ سے آبن صاحب کی سیادت پر لوگ شک کرتے تھے، کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ان ہی شیخ اَبن کے مزار پر سیدنا الامام الکبیر مولانا احمد حسن امروہوی کے ساتھ تشریف لے گئے جن کا نسبی تعلق شیخ اَبن سے تھا۔ مزار پر مراقبہ کے بعد سر اٹھا کر مولانا احمد حسن کو خطاب کرکے حضرت والا فرمانے لگے، کہ

"مولوی احمد حسن اب شبہ نہ کرنا اپنی سیادت میں"۔

یہ اور اسی قسم کی بہت سی باتیں لوگ جو نقل کرتے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے "سماع موتیٰ" کے مسئلہ میں حضرت والا نے جس پہلو کو ترجیح دی ہے، ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور وہ کرہی کیا سکتے تھے۔ کیا اپنے مشاہدے کا انکار کرتے؟ لیکن بایں ہمہ اسی مطبوعہ مکتوب میں جس میں "سماع موتیٰ" کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کو نقلی وعقلی وجوہ کی روشنی میں پیش فرمایا ہے، اسی میں یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

"عوام اپنے خیال خام میں اولیاء کو قادر اور متصرف یعنی "غنی محتاج الیہ" سمجھتے ہیں، تو اگر اس زمانہ میں اس امکان استماع کا بھی چرچا کیا جائے تو اس عمل سے نفع دینی تو کچھ متصور نہیں، البتہ تقویۂ مضامین شرکیہ کا گمان غالب ہے"۔

اس لئے مصلحت کا تقاضا آپ نے یہی قرار دیا ہے کہ

"مناسب ہے کہ عوام کو فقط طریقہ مسنونہ زیارت قبور کا تعلیم کیا جائے اور اس سے زیادہ کی اطلاع نہ ہونے دے"۔ صدا جمال قاسمی

یہی آپ کا خیال بھی تھا، دیکھنے والوں کا بیان بھی یہی ہے، کہ اسی کے مطابق آپ کا عمل بھی تھا،

لہ اس مکاشفہ کا تذکرہ مولوی اظہار الحق سہیل عباسی امروہوی نے اپنے خط میں کیا ہے، اسی میں یہ بھی لکھا ہے کہ مولوی محمود احمد صاحب عباسی نے بعد کو تاریخ امروہہ کتاب لکھی، جس میں شاہی وثائق، اور پرانے کاغذات پیش کئے گئیں جن سے شیخ اَبنؒ کی سیادت کی تاریخی شہادت بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے ۱۲

دوسرے لفظوں میں چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ

صراط الذین انعمت علیھم — اُن لوگوں کا راستہ جن پر آپ نے انعام فرمایا

پر قائم و دائم رہنے کی جو آرزو قرآن ہی نے مسلمانوں میں پیدا کی ہے، چاہتے تھے کہ اس آرزو کا زور بھی ان کے دلوں میں کم نہ ہو، ارواح ثلاثہ میں امیر شاہ خان مرحوم کے حوالہ سے یہ روایت جو نقل کی گئی ہے کہ

"کسی[1] عامی نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ حضرت یہ جو بزرگوں کے قریب دفن ہونے کی تمنا کرتے ہیں اس سے کیا فائدہ؟ جب کہ نہ کسی کی برائی کسی پر پڑیگی، نہ کسی کی نیکی کسی کے کام آئے گی"[2]

شرکانہ آلودگیوں کے متعلق جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی پیدائش میں بزرگوں کے احترامی جذبات کی حوصلہ افزائیوں کو زیادہ دخل ہے۔ ان کے لئے بڑا اچھا موقعہ تھا کہ اس عامی کے عامیانہ خیال کی تائید کرتے ہوئے کہہ دیتے کہ ہاں تم سچ کہتے ہو۔ لیکن امیر شاہ خاں مرحوم کا بیان ہے، کہ

---

[1] یہ سائل الدین نامی قصائی تھا جو دیوبند کا باشندہ تھا اس نے حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا دور اپنی ابتدائی عمر میں پایا تھا۔ پھر حضرت الاستاذ علامہ انور شاہ صاحب رحمہ اللہ سے بیعت ہوا۔ اس نے یہ واقعہ مجھ سے بھی بیان کیا تھا۔ محمد طیب غفرلہٗ

[2] میرا مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے قرآنی نصوص مثلاً لیس للانسان الا ما سعی (یعنی نہیں ہے آدمی کیلئے مگر وہی جو کچھ اس نے خود کوشش کی) یا لا تزر وازرۃ وزر اخری (ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھائے گا) کو پیش نظر رکھ کر اس قسم کا فیصلہ کرنا کہ شفاعت ہی سے کوئی مستفید ہو سکتا ہے، اور خواہ مالی ہو یا بدنی کسی قسم کی عبادت کا ثواب دوسروں تک نہیں پہنچایا جا سکتا، ظاہر ہے کہ عامیانہ فیصلہ سے زیادہ اس کی کوئی وقعت نہیں ہے، کیونکہ شفاعت کا قانون ہو، یا ایصال ثواب کا ان سب کی بنیاد اس پر قائم ہے کہ آدمی پہلے ایمانی دائرے میں اپنے آپ کو داخل کر چکا ہو، ورنہ جو مومن نہیں ہے یقیناً نہ اسکے لئے شفاعت ہی مفید ہو سکتی ہے اور نہ ایصال ثواب کے قانون سے وہ مستفید ہو سکتا ہے، پس معلوم ہوا کہ ان امور سے بھی فائدہ ایمانی دائرے میں داخل ہونے کی سعی اور کوشش ہی سے آدمی کو پہنچتا ہے، پس ان صورتوں میں بھی یہی بات صادق آتی ہے کہ اپنی سعی اور کوشش ہی سے وہ مستفید ہوا۔ اگر مومن ہونے کی سعی اور کوشش اس کی طرف سے نہ ہوتی تو یقیناً وہ ان قوانین سے مستفید نہیں ہو سکتا تھا۔

سیدنا الامام الکبیر نے اس کے برعکس اس عامی کے اس غلط احساس کا ازالہ کرنا چاہا، چونکہ بے چارا عامی آدمی تھا، عالمانہ طریقہ سے فہمائش مناسب معلوم نہ ہوئی، بلکہ اس وقت وہ جس کام میں مشغول تھا، یعنی حضرت والا کو پنکھا جھل رہا تھا۔ پنکھا بڑا تھا حضرت کے سوا اور بھی جو اس مجلس میں شریک تھے۔ پنکھے کی ہوا سے مستفید ہو رہے تھے۔ سامنے کی اسی مثال کی طرف توجہ دلاتے ہوئے پوچھنے والے سے دریافت فرمایا کہ "بھائی! تم اس مجمع میں پنکھا کس کو جھل رہے ہو؟" اس نے عرض کیا کہ "حضرت آپ کو۔" آپ نے پوچھا کہ "ہوا اوروں کو بھی لگ رہی ہے" اس نے کہا کہ ہاں۔ تب یہ کہتے ہوئے کہ "یہ جواب ہے تمہارے سوال کا" اس کو یہ سمجھانے لگے کہ

"حق تعالیٰ کی طرف سے جب رحمت و مغفرت کی ہوائیں چلتی ہیں، تو مقصود وہی بزرگ ہوتے ہیں، مگر حسب قرب و بعد پہنچتی ہیں، سب آس پاس والوں کو بھی"۔ ص ۱۸۱

کسی مولوی کے چپ ہونے کے لئے خواہ سامنے کی یہ مثال کافی ہو، یا ناکافی، لیکن پوچھنے والا غریب عامی آدمی تھا۔ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تسلی اسی مثال سے ہو گئی، اب مسئلہ کی نوعیت خواہ کچھ ہی ہو، جس پر تفصیلی بحث کا یہاں موقع نہیں[1] ہے۔ میں تو صرف یہ دکھانا چاہتا تھا کہ مشرکانہ آلودگیوں کے خطرات سے جو خود بھی چوکنا رہتا تھا اور چاہتا تھا کہ

---

[1] مسئلہ کی اصل علمی حقیقت وہی ہے جس کی طرف اپنے نوٹ میں خاکسار نے اشارہ کیا ہے، بزرگوں کے مکانی جوار سے بھی فائدہ مومن ہی کو پہنچ سکتا ہے، ورنہ ابوجہل خواہ مکہ ہی میں دفن ہوتا، اس غریب کو زمین کی پاکی سے کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ آخر دفن ہونے میں بزرگوں کے جوار اور قرب مکانی کا کوئی فائدہ اگر نہ ہوتا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ روضہ پاک میں دفن ہونے کی آرزو کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی آرزو کیوں قرار دیتے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے امیر شاہ خان کی اس روایت پر ایک حاشیہ بھی ارقام فرمایا ہے، جس میں مشہور حدیث هم القوم لا یشقی جلیسهم (اللہ والے لوگ ایسی قوم کے لوگ ہیں جن کا ہم نشین ناکام نہیں ہو سکتا) کی عمومیت سے بھی مسلمانوں کے اس خیال کی تائیدی شہادت پیدا کی ہے کہ بزرگوں کے قریب دفن ہونا مردے کے لئے فائدہ بخش ہے، ایک ضعیف روایت کا بھی اس سلسلہ میں لوگ تذکرہ کرتے ہیں جس میں صالحین کے مقبرے میں دفن ہونے کی ہدایت کی گئی ہے اگرچہ محدثین کو اس روایت کی سند پر اعتماد نہیں ہے (باقی ص ۳۶ پر)

احترام ہی سے لیتے ہیں مشکل ہی سے اس کی نظیر پیش ہو سکتی ہے کہ مخالفوں نے بھی حضرت والا کی شان میں ان نا ملائم اور نا شائستہ الفاظ کو استعمال کیا ہو' جن کے استعمال کرنے کے عادی اس زمانہ کے مناظرہ باز مولوی عموماً ہو گئے تھے ؟

مگر مجھے اس پر اس لئے تعجب نہیں ہوتا کہ حضرت والا نے جس طرز عمل کو اختیار فرمایا تھا' یہ اس کا لازمی نتیجہ تھا' قرآن ہی میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ دشمنوں کو بھی دوست بنانے کا یہ قدرتی طریقہ ہے' مگر ہر ہوسناک کا یہ کام نہیں ہے۔

وما یلقٰھا الا الذین صبروا	اور یہ مقام نہیں عطا کیا جاتا مگر انہیں کو جو صابر د بردبار ہیں اور نہیں دیا جاتا مگر انہیں کو جو بڑے صاحب نصیب ہیں۔
وما یلقٰھا الا ذو حظ عظیم	

یعنی ہر دل کو یہ وسعت اور ہر آنکھ کو فراخی کی یہ دولت کب نصیب ہوتی ہے ؟

خلاصہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی دینی تربیت و اصلاح کا جو کام بھی آپ کرتے رہے' اس میں دل آزاری یا دوسروں کی تحقیر و توہین سے بچنے کی ممکنہ کوششوں میں بھی ہم آپ کو مشغول پاتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ "مداہنت" یا بے جا اغماض و چشم پوشی بھی آپ کی عادت نہ تھی۔ اس کی متعدد مثالیں گذر چکیں کہ ادنیٰ درجہ کے عامی آدمیوں کی دعوت بھی سیدنا الامام الکبیر رد نہیں کرتے تھے' اور شاید کر نہیں سکتے تھے۔ دیوبند کے نورباف اللہ دیا کا قصہ گذر چکا ہے کہ برستے ہوئے پانی میں کمل کا جوتا باندھ کر اس غریب کے گھر اندھیری رات میں آپ پہنچے' اور ماش کی روٹی' ماش کی دال جو اس نے پیش کی' یہ جانتے ہوئے کہ انہضام اس کا دشوار ہوگا' محض اس کی دل دہی کے لئے نوش جان فرمایا' لیکن اسی کے ساتھ دعوتوں ہی کے سلسلہ میں مولانا حکیم منصور علی خاں صاحب حیدرآبادی راوی ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر کا یہ کلی دستور تھا کہ

"جاہلوں کی نذر و نیاز کا کھانا کبھی نہیں کھاتے" صفحہ ۱۹۲ مذہب منصور

یہ "نذر و نیاز" کا قصہ جو ہندی مسلمانوں کی دینی زندگی کا کسی زمانہ میں تقریباً کچھ لازمی جزو کی

حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ جس کا افسانہ طویل ہے، خانوادہ ولی اللہی کے مصنفین کی کتابوں میں خصوصاً حضرت شاہ عبد العزیز و مولانا شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہما کی طرف فتووں کی کتابیں جو منسوب ہیں ان میں اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر آپ کو سیر حاصل بحثیں ملیں گی۔ اس زمانہ میں شیخ سدو کے نام کے بکرے، اور سید احمد کبیر و حضرت بو علی قلندر کے نام کے گاؤ، حضرت شیخ عبد القادر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے اسم گرامی کے نام مرغ، کے چھوڑنے اور آخر میں ان کو ہار پھول پہنا کر ذبح کر کے دعوتوں کے اڑانے کا عام ذوق پھیلا ہوا تھا۔ مشکل ہی سے مسلمانوں کی کوئی آبادی شمالی و جنوبی ہند میں ہوگی، جس میں نذر کئے ہوئے مذکورہ بالا جانور گھومتے پھرتے نہ نظر آتے ہوں، اب تو بجز پیران پیر کے مرغ کے دوسرے قصے کم از کم شمالی ہند میں ختم ہو چکے ہیں[۱]۔ اسی خاندان کے بزرگوں کی جد و جہد سے تطہیر و تزکیہ کا یہ کام پورا ہوا۔ شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اس قسم کے نذر کئے ہوئے تمام جانوروں کو ما اھل بہ لغیر اللہ کے تحت داخل کر کے فتوی دیا تھا کہ ان کے گوشت کا کھانا جائز نہیں ہے جس پر بڑے ہنگامے برپا ہوئے۔ سیدنا الامام الکبیر نے بھی ایک مضمون حضرت شاہ صاحب کے فتوے کی تائید میں ارقام فرمایا تھا، جو قاسم العلوم نامی "مجموعہ مکاتیب" میں شریک ہے، انشاء اللہ کتاب کے اگلے حصہ میں اس کا تفصیلی تذکرہ کیا جائے گا، یہاں یہ کہنا ہے کہ خود حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ جن کے فتوے پر طوفان برپا ہوا تھا، وہی زندہ جانوروں کے متعلق جہاں اس پر مصر تھے کہ خدا ہی کے نام پر ان کو کیوں نہ ذبح کیا جائے، جب بھی ان کے گوشت کا کھانا درست نہ ہوگا۔ وہیں یہ فتوی ان ہی کی طرف ان کے مجموعہ فتاوی میں منسوب کیا گیا ہے کہ حیوانی نہیں بلکہ ما لبدہ کشیر برنج (کھیر) پلاؤ وغیرہ جیسے کھانے پر اگر فاتحہ دیا گیا ہو، تو ان کا حکم کیا ہے، کسی نے دریافت کیا، جواب میں لکھا ہے کہ شاہ صاحب نے ارقام فرمایا کہ

"اگر فاتحہ بنام بزرگے دادہ شد پس اغنیا را ہم خوردن ازان جائز ست[۲]" صا۱۴

---

[۱] یہ مرغ شمالی ہند سے بالکل پرواز کر چکا ہے، یہاں اس کا کوئی نام بھی نہیں جانتا محمد طیب غفرلہ [۲] (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

میرے سامنے مسئلہ کی تفصیل نہیں ہے، حاشیہ میں حضرت شاہ رفیع الدین کے جن فتووں کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے تفصیل کے لئے ان کو پڑھنا چاہیئے۔ بلکہ کہنا یہ ہے کہ شاہ عبدالعزیز کی طرف یہ فتویٰ حالانکہ منسوب تھا، لیکن باوجود اس کے آپ دیکھ رہے ہیں اس احتیاط کو کہ سیدنا الامام الکبیر اس قسم کے مشتبہ کھانوں سے بھی پرہیز ہی فرماتے رہے، اور دعوت کرنے والوں کی دل شکنی کی پرواہ بھی اس راہ میں نہیں کی جاتی تھی حالانکہ آپ کی افتاد طبع کے لحاظ سے جہاں تک میں خیال کرتا ہوں یہ چیز ناقابل برداشت تھی۔

مگر عملی احتیاط کے ساتھ ساتھ عام مسلمانوں کی دینی کمزوریوں خصوصاً ان کی دینی زندگی کی بیرونی آلائشوں یعنی "بدعات" کے مسئلہ میں سیدنا الامام الکبیر کے نقطۂ نظر کا صحیح اندازہ اس حکیمانہ تقسیم کر ہو سکتا ہے جسے اس مسئلہ میں آپ نے اختیار فرمایا ہے، یعنی یہ فرماتے ہوئے کہ جو حیثیت کسی جاہل مریض کی طبیب کامل کے مقابلہ میں ہوتی ہے، یہی حیثیت امت کے عام افراد کی اللہ اور اس کے رسول کے مقابلہ میں ہے، یہی نہیں بلکہ اسی کے بعد جو یہ فرمایا گیا ہے، کہ

"طبیب کامل اور بیمار جاہل میں اتنا فرق نہیں، جتنا خدا و رسول، اور امت میں فرق

(متعلقہ صفحہ گذشتہ) ۵ میں نے شاہ صاحب کے اس فتوے کے نقل کرنے میں قصداً تمریضی پیرایہ بیان اختیار کیا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف بزرگوں سے کان میں یہ بات پڑی ہے کہ فتاویٰ کا جو مجموعہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے شائع کیا گیا ہے، اس میں کچھ تصرفات بھی ہوئے ہیں واللہ اعلم بالصواب۔ مطبع مجتبائی کے مطبوعہ نسخے (۱) مذکورہ بالا الفاظ نقل کئے ہیں چند خاص فتوے شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے بھی شائع ہوئے ہیں۔ اس زمانہ کی علماء کو خصوصیت کے ساتھ ان جوابوں کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ نذر و نیاز وغیرہ الفاظ ہندوستان میں جو استعمال ہوتے ہیں "نہ بمعنی شرعی است کہ ایجاب غیر واجب ست از جنس عبادات مقصودہ بطریق تقرب الی اللہ" فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں ان الفاظ کا استعمال بمعنی عرفی ست چہ عرف آن ست کہ انچہ پیش بزرگان می برند نذر و نیاز گویند" لکھا ہے کہ شرعی معنی جو نذر کے ہیں "برائے اولیاء اللہ حرام است" اسی طرح فاتحہ میں بھی شاہ صاحب نے بڑی تفصیل سے کام لیا ہے اور لکھا ہے کہ بتوں اور شیاطین کے آگے بھینٹ چڑھانے کی جو نوعیت ہوتی ہے اگر فاتحہ دلانے والے کی نیت میں بھی کچھ اسی قسم کی باتیں شریک ہیں تو شرک کی مد میں فاتحہ داخل ہو جاتا ہے۔ لیکن ایصال ثواب کا مطلب ہے تو جائز ہے، مسلمانوں کو سمجھانا چاہئے کہ وہ چڑھاوے یا بھینٹ کا، اور اگر رکھتے ہوں تو اس کو اپنے اندر سے نکالیں۔ ۱۲

اور قواعد کلیہ کو مثل ایجاد تعزیہ و ماتم داری کو بدعت کبریٰ، اور کمی و بیشی صور جزئیہ کو
بدعت صغریٰ کہتے ہیں۔"

اور لکھا ہے کہ

"برائی کی کمی و زیادتی بدعات میں بقدر بڑائی و چھوٹائی بدعات کے سمجھتے ہیں۔"

حاصل یہی ہے، کہ بدعت چھوٹی ہو، یا بڑی، بدعت ہی ہے، اور گمراہی و ضلالت کے سوا اور
ہو ہی کیا سکتی ہے۔ لیکن ایک ہی لاٹھی سے بدعت کی ہر قسم کو ہانکنا "شرعی حقائق" کی صحیح یافت
سے محرومی کی دلیل ہے، اوروں کا خیال خواہ کچھ ہی ہو، لیکن اس باب میں سیدنا الامام الکبیر نے اپنے
احساس کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا ہے کہ

"وہ بدعتیں جن کو کبریٰ کہئے، بیشتر فرقہائے باطلہ مثل شیعہ و خوارج میں پائے جاتے
ہیں اور کمتر بعض جماعات اہل سنت میں نظر آتے ہیں۔"

اور "اہل سنت کے بعض جماعات" جن میں "بدعت کبریٰ کی بعض قسموں کی نشاندہی حضرت والا نے
فرمائی ہے، سمجھا آپ نے یہ کون لوگ ہیں؟ الحمد للہ کہ اب ہندوستان میں ان کا پتہ نہیں ہے۔ سیدنا
الامام الکبیر جس زمانہ میں یہ لکھ رہے تھے، اس وقت تک ان لوگوں سے ملک پاک نہیں ہوا تھا، یہ بے قید
فقیروں کی مختلف ٹولیاں تھیں، جن میں بعض رسول شاہی بعض امام شاہی، بعض نوشاہی، بعض جلید
شاہی، وغیرہ وغیرہ بیسیوں ناموں سے نکل پڑی تھیں[1]۔ بہر حال حضرت والا نے بھی اہل سنت کے
ان بعض جماعات "جن کی بدعات کو آپ نے "بدعات کبریٰ" کے ذیل میں شمار کیا ہے، ان کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے اسی موقعہ پر یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

[1] اس زمانے کے اباحیہ اور بے قید فقیروں کی تاریخ آپ کو کچھ تو امیر شاہ خان مرحوم کے ملفوظات (الماح ثلاثہ)
میں ملے گی، خاکسار نے بھی جو کتاب "اطلاقی تصوف" کے نام سے لکھی ہے، مقالات کی شکل میں اس کا اکثر
بیشتر حصہ "الحق" نامی حیدرآباد کے ایک ماہوار رسالہ میں شائع بھی ہو چکا ہے اس میں بھی کچھ ان ٹولیوں کے
حالات مل سکتے ہیں، "مناقب العارفین" صوفیہ ہند کا ایک تذکرہ رامپور کے ایک مصنف نے لکھا ہے، اس میں بھی کچھ
چیزیں مندرج ہو گئی ہیں ۱۲

دوسرے لفظوں میں چاہیں تو حضرت والا کی اصطلاح کی رو سے کہہ سکتے ہیں کہ "بدعات صغیرہ"

کے متعلق جہاں آپ کا یہ طرز عمل تھا، وہیں ان ہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے

اصلاحی نظام نامہ میں علاوہ ان کے اس قسم کی چیزیں بھی شریک تھیں جن پر بدعت کے اصطلاحی

لفظ کا اطلاق تو نہیں ہو سکتا تھا، لیکن امتداد زمانہ سے بدعت کا رنگ ان میں پیدا ہو چلا تھا، یا

بجائے بدعت کے اسلامی تعلیمات کے دوسرے واقعات کا اقتضا تھا کہ ان کی طرف بھی توجہ

کی جائے۔[1]

---

[1] میرا مطلب یہ ہے کہ اخروی ثواب و عقاب کے نتائج جن اعمال و افعال پر مرتب ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس کے جاننے کا واحد ذریعہ صرف وحی و نبوت ہے، اسی لئے کسی قول و عمل حرکت و سکون پر یہ حکم لگانا کہ خدا اس سے خوش ہوتا ہے یا ناخوش، یہ کام صرف پیغمبروں کا ہے۔ اسی لئے بدعت نام ہے اسی اضافہ کا جس کے متعلق اخروی ثواب و عقاب یا حق تعالیٰ کی خوشی و ناخوشی کا خیال شریعت کے توسط کے بغیر قائم کر لیا جائے۔ ورنہ اس خیال کے بغیر کسی قسم کا کام اگر کیا جائے تو محض اس لئے کہ عہد نبوت و قرون مشہود لہا بالخیر میں اس کا پتہ نہیں چلتا، ہم اس کو بدعت نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ یہ الدین کے اس مجموعہ میں اضافہ نہیں ہے جس کے ساتھ خدا کی رضامندی و نارضامندی کا تعلق ہوتا ہے۔ من احدث فی امرنا ھذا (جس نے ہمارے اس کام میں نئی بات کا اضافہ کیا) بدعت کی حقیقت کی طرف ان الفاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اشارہ فرمایا ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ دین میں اضافہ یہی بدعت ہے، حضرت الاستاذ الامام الکشمیری رحمۃ اللہ علیہ اسی بنیاد پر فرمایا کرتے تھے کہ شادی بیاہ وغیرہ جیسی تقریبوں میں جن رسوم کا اضافہ مسلمانوں نے کر لیا ہے۔ مثلاً گشت کرانا، روشنی اور بھی واہی تباہی باتیں تو ان رسوم کو بدعت کی مد میں ہم اس لئے داخل نہیں کر سکتے کہ ان اعمال و افعال سے ثواب و عقاب کا مسلمانوں کے نزدیک تعلق نہیں ہے، یہ کوئی نہیں سمجھتا کہ دولہا کو گھوڑے پر بٹھا کر شہر میں گشت اگر نہ کرایا جائے گا، تو گناہ ہوگا یا کرنے پر ثواب ملے گا۔ فرماتے تھے کہ ان رسوم کو بجائے بدعت کے اسراف فضول خرچی لغو لایعنی اعمال وغیرہ کی مدوں میں ہم داخل کر سکتے ہیں کہ شریعت ان امور کو بھی پسند نہیں کرتی بلکہ چاہئے تو اس کو اہی و حماقت کی مد میں شریک کر دیجئے۔ اپنے آپ کو احمق بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرنا یہ بھی غیر شرعی فعل ہے۔ اسی طرح فرماتے تھے کہ میت کے متعلقہ رسوم کی نوعیت ذرا مختلف ہے۔ موت کا تعلق عالم آخرت سے ہے، کرنے والے ثواب و عقاب کے خیال سے نہ بھی کریں۔ لیکن موت کی خصوصی کیفیت میں اس کی صلاحیت ہے کہ رفتہ رفتہ اس خیال کو عوام میں پیدا کر دے کہ فلاں رسم کے کرنے سے مردے کو آرام و سکون ملتا ہے نہ کیا جائے گا تو دکھ ہوگا، یہ پھر وہی ثواب و عقاب کا خود تراشیدہ عقیدہ ہے جو اعمال و افعال میں بدعت کا رنگ پیدا کر دیتا ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

اور یہ عداوتیں، جو محبت واخوت کی جگہ اٹھ کھڑی ہوئی ہیں، فرماتے ہیں کہ بڑے اہم مسائل سے ان کا تعلق نہیں ہے، بلکہ

"دراں مسائل کہ متفق علیہ ابوزند اختلاف پدید آمد" ص۴۲ فیوض قاسمیہ

اور ایک دوسرے خط میں جس کی زبان اردو ہے، بڑے اندوہناک لہجہ میں ارقام فرماتے ہیں،

"یہ اختلاف ہی موجب عداوت ہے، اور یہ عداوت باہمی موجب تفریق گر ہے"۔ ص۴۲

فرماتے تھے کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھنا ہی بے معنی ہے، تیرہ سو سال سے امت جو کچھ مانتی چلی آرہی ہے خواہ مخواہ اس میں شاخسانے نکالے ہی کیوں جائیں، اور اختلاف کسی وجہ سے اٹھ کھڑا ہی ہو تو اختلاف سے عداوت کیوں پیدا ہو، باہمی منافرت کے بغیر بھی کیا مسائل کی علمی تحقیقات ممکن نہیں،

بڑی مایوسی کے لہجہ میں اپنے اردو زبان والے خط میں ارقام فرماتے ہیں۔

"اس زمانہ میں ہر توقع بے جا ہے کہ اختلاف اٹھ جائے اور اتفاق پیدا ہو جائے"۔

پھر مرض کے سبب کی تشخیص خود ہی یہ فرمائی ہے کہ

"ابنار روزگار میں فہم وانصاف ہوتا، تو بعد فہمائش ممکن تھا کہ یہ اختلافات اٹھ جاتے"۔ ص۴۲

اور سچ پوچھئے تو ہماری یہ ساری رسوائیاں جو غیر قوموں کے سامنے ہوتی رہتی ہیں، "فہم وانصاف کی کمی" ہی کے نتائج ہیں، بلکہ فہم اور سمجھ لوگوں کی درست ہوتی، تو انصاف کا جذبہ خود بخود ابھر آتا، مگر کیا کیجے، بقول سعدی

گر از بسیط زمیں عقل منعدم گردد
بخود گماں نہ برد ہیچ کس کہ نادانم

اس زمانہ میں ہندوستان پر حاکمانہ اقتدار جس قوم نے اپنا قائم کر رکھا تھا، علمی تحقیقات کے سلسلے میں اس قوم کی عام روش اور طریقہ کا چرچا بھی یہاں پہنچنے لگا تھا، بظاہر میرا خیال ہے شاید اسی کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے اردو زبان والے اسی خط میں حضرت والا کی نوک قلم

سے یہ الفاظ بھی ٹپک پڑے ہیں۔ مکتوب الیہ کو مخاطب کر کے ارقام فرمایا گیا ہے۔

"مگر آپ جانتے ہیں کہ آج کل یہ دونوں (فہم و انصاف) نصیب اعدا ہیں"۔ ص۴۹

بہرحال باوجود ان مایوسیوں کے آپ کی طرف سے کوشش اسی کی جاری تھی کہ مسلمانوں میں جہاں تک ممکن ہو، اختلافات کی ناگوار اور مکروہ شکل اگر کلی طور پر ختم نہ ہو، تو ممکنہ حد تک ان کے دائرے کو کم کیا جائے۔

اسی قسم کے ایک مسئلہ کے متعلق اپنی ذاتی رائے کو درج کرنے کے بعد فارسی زبان کے ایک مکتوب میں مکتوب الیہ سے اس کی فرمایش کرتے ہوئے کہ دوسرے معتبر اہل علم و تقویٰ سے بھی استمزاج کر لیجئے۔ اور جو کچھ ان سے معلوم ہو، مجھے بھی اس سے مطلع کیجئے۔ کس لئے مطلع کیجئے؟ کیا اس لئے کہ پھر جواب الجواب تیار کر کے بھیجوں؟ نہیں ان ہی سے سنئے، ارقام فرماتے ہیں۔

"ایں نیاز مند را ہم اطلاع فرمائند تا بہ پیروی جم غفیر من ہم سر دہم و در پے تفرق کلمہ نہ شوم"۔ ص۲۹ فیوض قاسمیہ

لیکن اپنی ذات کی حد تک ان ترمیموں کے باوجود، اصل دین کے ساتھ آپ کی سرگرمیوں کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے، کہ ایک مسئلہ کے متعلق یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ شرعی[1] اصطلاحات

---

[1] قرآن مجید میں ایک سے زیادہ جگہ پر فرمایا گیا ہے کہ "الغیب" کا علم حق تعالیٰ کے سوا اور کسی کو نہیں ہے فقل انما الغیب للہ (یونس) ان اللہ یعلم غیب السماوات والارض (حجرات) لیکن اسی کے ساتھ قرآن ہی میں ہے کہ اپنے رسولوں میں جسے چاہتا ہے اللہ تعالیٰ غیب سے مطلع فرماتا ہے وما کان اللہ لیطلعکم علی الغیب ولکن اللہ یجتبی من رسلہ من یشاء (آل عمران)، اب سوال یہی ہے کہ غیر اللہ کو غیب کا علم جو عطا ہوتا ہے اس پر بھی "علم الغیب" کا اطلاق ہو سکتا ہے یا نہیں۔ حضرت والا نے ارقام فرمایا ہے کہ عام مسلمانوں میں یہی خیال پھیل گیا ہے کہ بالذات اور بالغیر غیب کے علم کی ان دونوں قسموں کو علم بالغیب کہتے ہیں۔ پس غیر اللہ کی طرف علم غیب کو منسوب کرنے کا یہ مطلب کوئی نہیں سمجھتا کہ بالذات غیب کا علم ان کو حاصل ہے بلکہ یہی سمجھتے ہیں کہ غیب کے اس علم سے حق تعالیٰ نے ان کو سرفراز کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسی صورت میں مسئلہ علم غیب کا اختلاف لفظی نزاع کی صورت اختیار کر لیتا ہے، تفصیل کے لئے دیکھئے فیوض قاسمیہ ص۴۷

کہتا ہو، اس کو خواہ مخواہ یہ کہنا کہ تم مسلمان نہیں بلکہ کافر ہو، یا مسلمان ہونے کے باوجود یہ باور کرنا کہ
قرآن کو خدا کا کلام نہیں سمجھتا، جیسے حضرت والا چاہتے تھے کہ اس معاملہ میں مولویوں کو محتاط
رہنے کی ضرورت ہے، اسی طرح عوام کو سمجھایا جا رہا ہے کہ جن الفاظ اور محاوروں کا ایک شرعی
مطلب مقرر ہو چکا ہے، اس مطلب سے ہٹا کر اپنے خود ساختہ معنی یا مطلب کو ان ہی الفاظ کی
طرف منسوب کر کے ان کو استعمال کرنے سے، چاہئے کہ اہل ایمان وایقان کو گزند نہ پہنچائیں،
آخر کوئی بدبخت مسلمان اپنے بچے کا نام "رسول اللہ" اگر رکھ لے[1] اور کہے مراد اس سے یہ نہیں
ہے کہ اس کا رکا اللہ کا پیغام پہنچانے والا ہے، بلکہ سب نام جیسے رکھے جاتے ہیں اسی
طرح یہی نام میں نے رکھ دیا ہے، تو خود سوچنا چاہئے کہ ایمانی جذبات کو وہ کتنی آزمائش
میں ڈال دے گا

یہ تھے سیدنا الامام الکبیر کی ان خدمات کے نمونے جن کا تعلق مسلمانان ہند کی اکثریت
یعنی اہل سنت والجماعت کی عموماً دینی زندگی کی تطہیر و تزکیہ سے تھا، جب تک زندہ رہے تحریراً
وتقریراً آپ مسلمانوں کو ان اصلاحی امور کی طرف متوجہ کرتے رہے، آپ کے بعد آپ کے تلامذہ
اور آپ کے قائم کردہ دار العلوم کے فارغ التحصیل علمائے ملک کے طول وعرض میں آئندہ
بھی اسی سلسلہ میں اپنی کوششوں کو جاری رکھا، خدا کا شکر ہے کہ اب تک وہ جاری ہے۔

ان کے بعد باشندگان ہند میں جو طبقہ شیعوں کا آباد ہے۔ اہل السنت والجماعت کے بعد
قدرتاً بہ نسبت دوسری قوموں کے وہی سامنے آسکتے تھے۔ مقدمہ میں عرض کر چکا ہوں کہ مغل
حکومت کے آخری دور میں ملک پر زیادہ تر شیعوں ہی کا سیاسی اقتدار مختلف وجوہ کی قائم ہو گیا تھا۔

[1] اور کیا کہا جائے مسلمان تو یہ بھی کر گذرے، ہندوستان کے ایک مشہور بیرسٹر آگرہ میں مسٹر نبی اللہ
نامی رہتے تھے، اور رسول خاں، نبی خان تو گویا عام اعلام مسلمانوں میں مروج ہو گئے ہیں۔ خود
یہ بے کر فقیر دار العلوم دیوبند میں جن دنوں پڑھتا تھا، صوبہ سرحد کے ایک مولوی
صاحب مدرسہ میں مدرس ہو کر تشریف لائے تھے۔ جن کا نام مولوی رسول خان
تھا۔ ۱۲

کرادیں تو ہم تشیع سے توبہ کرلیں گے، توخلاف دستور حضرت کو جوش آگیا، اور ان کے مطالبہ کی تکمیل پر آمادہ ہو گئے، مگر مطالبہ کرنے والے ہی بھاگ گئے۔

اسی پورقاضی ہی کے شیعوں کے متعلق مولانا طاہر صاحب نے اپنے والد ماجد حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر جس زمانہ میں پورقاضی پہنچے تھے تو اتفاقاً یہ محرم کا مہینہ تھا، حضرت والا کی تشریف آوری کی خبر پورقاضی کے شیعوں کو ہوئی تو ایک وفد ان کے سربرآوردوں کا خدمت گرامی میں حاضر ہوا اور یہ خواہش کی کہ ماتم کی مجلس میں شریک ہو کر پورقاضی کے شیعوں کو ممنون فرمایا جائے۔ خلاف توقع بجائے انکار کے حضرت نے فرمایا کہ میری ایک شرط بھی منظور کی جائے تو میں اس مجلس میں شریک ہو سکتا ہوں، جو شرط پیش کی گئی اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیعوں کے ساتھ حضرت والا کے قلبی تعلق کا کیا حال تھا؟ شرط یہ تھی کہ اسی مجلس میں

جو کچھ عرض کروں، اسے سن لیں "

وفد نے اس شرط کو تو منظور کرلیا، مگر اسی کے ساتھ ان کی طرف سے مزید مطالبہ پیش ہوا کہ آپ کے وعظ سے

" پہلے مجلس ہوگی، اس میں حلوا بھی تقسیم ہونا ہے، وہ بھی آپ کو قبول کرنا پڑیگا"

آپ نے اس اضافہ کو بھی مان لیا اور حسب وعدہ ماتم کی مجلس میں حاضر بھی ہوئے، حلوا جو دیا گیا اسے بھی لے لیا، جب شیعوں کی پیش کردہ شرائط پوری ہو گئیں، تب ماتم کی اسی مجلس میں حضرت والا نے کھڑے ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور وصیت

ترکت فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی	میں تم میں دو بھاری چیزوں کو چھوڑتا ہوں۔ اللہ کی کتاب، اور اپنی اولاد

پر ایک مفصل ومبسوط تقریر فرمائی، سننے والے خلاصہ یہ بیان کرتے تھے کہ ہدایت کے لئے حضرت والا نے فرمایا علم وعمل دو ہی چیزوں کی ضرورت ہے۔ علم کے لئے تو اللہ کی کتاب ہے اور

تھا، مثل دیگر حضار شیعہ مذہب حمائل میں دیکھ دیکھ پڑھتے تھے۔ تس پر بھی دو جگہ غلط پڑھ گئے"۔ ص۸ ہدیۃ الشیعہ

ظاہر ہے کہ حامد علی خاں کی مسجد میں یہ جلسہ جیسا کہ معلوم ہوتا ہے خاص شیعوں کی طرف سے منعقد ہوتا تھا، اور گو یہ واقعہ غدر سے پہلے کا ہے، عمر حضرت والا کی زیادہ نہ ہوگی، ممکن ہے طالب علمی کے دنوں کی بات ہو۔ لیکن اس زمانہ میں خانوادہ ولی اللّٰہی کی وجہ سے شیعوں اور سنیوں کی باہمی کش مکش جس حد تک پہنچ چکی تھی۔ اس کے لحاظ سے میں تو اس کو بھی حضرت والا کی طبعی وارستہ مزاجی ہی کا نتیجہ سمجھتا ہوں، کچھ بھی ہو، کہنا یہ چاہتا ہوں کہ پور قاضی کے شیعوں کی ماتمی مجلس میں آپ کی شرکت اور اسی مجلس میں حلوے کا قبول فرمانا ایک ایسا واقعہ تھا کہ پور قاضی کے سنیوں میں معلوم ہوتا ہے جس کی وجہ سے کافی کھل بلی مچ گئی۔ عام سنی مسلمانوں پر علماء اہل السنت والجماعت کی وجہ سے اس زمانہ میں قدغن تھا کہ شیعوں کی ماتمی مجالس میں شرکت سے بھی پرہیز کریں اور ان مجالس میں جو چیزیں تقسیم ہوتی ہیں ان کو نہ لیا کریں۔ مولوی طاہر صاحب کی روایت میں ہے کہ حضرت والا سے پوچھنے والوں نے جب پوچھا تو پہلے کچھ اعراض فرمایا گیا۔ لیکن جب زیادہ اصرار اس کی طرف سے بڑھا، تب لکھا ہے کہ واقعہ کو سمجھاتے ہوئے فرمایا گیا کہ

"بھائی اگر کوئی قوی آدمی تھوڑا سا زہر کھالے تو اس کے حق میں وہ نقصان نہیں کرتا۔ لیکن اسی زہر کو ضعیف اگر کھا جائے تو مر جائے"۔

اور اسی کے بعد دل کی جو بات تھی اس کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا گیا کہ ان کی مجلس میں شریک ہو کر "اگر میں نے حلوا[1] لیا، اور قبول کر لیا تو ان کی مجلس میں کلمۂ حق بھی تو پہنچا دیا"۔

---

[1] حلوہ لینا ثابت ہے۔ کھانا ثابت نہیں، اور ہو بھی نہیں سکتا جو ذرا سے مشتبہ مال سے بھی اجتناب کر لینے کے عادی تھے وہ اس حلوہ کو کیسے کھا سکتے تھے۔ یہ قبول حلوہ محض تبلیغ کلمۂ حق کی ضرورت سے کیا گیا۔ جب کہ شیعوں نے کلمۂ حق سننے میں قبول حلوہ کی شرط لگا دی تھی۔ یعنی اس کے بغیر وہ کلمۂ حق سننا نہیں چاہتے تھے۔ پس حضرت نے اس قبول حلوہ کو ادائے فرض کے مقدمہ کی حیثیت سے گوارا فرمایا۔ محمد طیب غفرلہ

پکے تھے ان کو اطمینان و سکینت کی خنکیوں سے سرفراز کیا گیا۔ اس کے لئے تو اضلاع مظفرنگر و سہارنپور وغیرہ کے قصبات اور دیہات کے مسلمانوں کی دینی زندگی جہاں تک میرا خیال

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ) اس سے حضرت نٹیں، تو دوسرے کونہ کا اور پھر اسی طرح تیسرے اور چوتھے کونہ کا۔ اور اس طرح وعظ نہ ہونے دیا جائے۔ ان ہی اعتراض و جواب میں مبتلا کر کے وقت ختم کر دیا جائے۔ اب غیبی مدد اور حضرت والا کی کرامت کا حال سنئے کہ حضرت نے وعظ شروع فرمایا۔ جس میں گاؤں کی تمام شیعہ برادری بھی جمع تھی اور وہ وعظ اسی ترتیب سے اعتراضوں کے جواب پر مشتمل شروع ہوا جس ترتیب سے اعتراضات لے کر مجتہدین بیٹھے تھے۔ گویا ترتیب کے مطابق جب کوئی مجتہد اعتراض کرنے کے لئے گردن اُٹھاتا تو حضرت اسی اعتراض کو خود نقل کر کے جواب دینا شروع فرماتے۔ یہاں تک کہ وعظ پورے سکون کے ساتھ پورا ہو گیا اور شیعوں کے ان مقررہ شبہات کے مکمل حل سے گاؤں کے شیعہ اس قدر مطمئن اور منشرح ہوئے کہ اکثریت نے توبہ کر لی اور سنی ہو گئے۔

مجتہدین اور مقامی شیعہ چودھریوں کو اس میں اپنی انتہائی سبکی اور خفت محسوس ہوئی تو انہوں نے حرکت مذبوحی کے طور پر اس شرمندگی کو مٹانے اور حضرت والا کے اثرات کا ازالہ کرنے کے لئے یہ تدبیر کی کہ ایک نوجوان لڑکے کا فرضی جنازہ بنایا اور حضرت سے آ کر عرض کیا کہ حضرت نماز جنازہ آپ پڑھا دیں۔ پروگرام یہ تھا کہ جب حضرت دو تکبیریں کہہ لیں تو صاحب جنازہ اک دم اٹھ کھڑا ہو، اور اس پر حضرت کے ساتھ استہزاء اور تمسخر کیا جائے۔ حضرت والا نے معذرت فرمائی کہ آپ لوگ شیعہ ہیں اور میں سنی۔ اصول نماز الگ الگ ہیں۔ آپ کے جنازہ کی نماز مجھ سے پڑھوانے میں جائز کب ہوگی؟ شیعوں نے کہا کہ حضرت بزرگ ہر قوم کا بزرگ ہی ہوتا ہے۔ آپ تو نماز پڑھا ہی دیں۔ حضرت نے ان کے اصرار پر منظور فرما لیا۔ اور جنازہ پر پہنچ گئے۔ مجمع تھا۔ حضرت ایک طرف کھڑے ہوئے تھے کہ چہرہ پر غصہ کے آثار دیکھے گئے۔ آنکھیں سرخ تھیں اور انقباض چہرہ سے ظاہر تھا۔ نماز کے لئے عرض کیا گیا تو آگے بڑھے اور نماز شروع کی۔ دو تکبیریں کہنے پر جب طے شدہ کے مطابق جنازہ میں حرکت نہ ہوئی تو پیچھے سے کسی نے "ہونہہ" کے ساتھ صاحب جنازہ کو اٹھ کھڑے ہونے کی سنسکار دی۔ مگر وہ نہ اٹھا۔ حضرت نے تکبیرات اربعہ پوری کر کے اُسی غصہ کے لہجہ میں فرمایا کہ "اب یہ قیامت کی صبح سے پہلے نہیں اٹھ سکتا۔" دیکھا گیا تو مردہ تھا۔ شیعوں میں رونا پیٹنا پڑ گیا، اور بجائے حضرت والا کی سبکی کے خود اُن کی سبکی اور سبکی ہی نہیں سبکی موت آ گئی۔ اس کرامت کو دیکھ کر باقی ماندہ شیعوں میں سے بھی بہت سے تائب ہو کر سنی ہو گئے۔

محمد طیب غفرلہٗ

(دیوبندی علماء کی حکایات صفحہ ۳۲۶)
(زلزلہ صفحہ ۵۰)

(دیوبندی علماء کی حکایات صفحہ ۳۲۹)
(زلزلہ صفحہ ۵۰، ۵۱)

لے بجائے تفضیل کے لکھا ہے کہ

"مادہ رفض کا غالب تھا" ص ۳۶

اسی وجہ سے آپ کے زمانہ میں بلکہ آپ کے ساتھ کش مکش کی صورت اسی دیوبند میں جو پیش آئی وہ سننے کے قابل ہے، اس کا ذکر سوانح مخطوطہ کے مصنف نے بھی کیا ہے۔ تفصیل اس واقعہ کی مولانا محمد طیب الحفید کے مراسلہ سے معلوم ہوئی۔

واقعہ یہ ہے، یاد ہوگا کہ دیوبند میں سیدنا الامام الکبیر کے گھر کی عام ضرورتوں کی سربراہی کا تعلق دیوان جی محمد یٰسین صاحب سے تھا، حضرت والا کے فدائیوں میں تھے، ان ہی کا قصہ ہے کہ مرید ہونے کی خواہش سیدنا الامام الکبیر سے ظاہر کی۔ لیکن آپ نے حضرت گنگوہی سے مرید ہو جانے کا حکم دیا۔ اسی وقت گنگوہ جا کر حکم کی تعمیل کر کے سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں حاضر ہو کر پھر مستدعی ہوئے کہ اب تو مجھے اپنا مرید بنا لیا جائے۔ حضرت نے فرمایا کہ تم تو مرید ہو چکے، بولے مرید کہاں ہوا۔ صرف آپ کے حکم کی تعمیل کی سعادت سے سرفراز ہوا ہوں۔ عرض کا یہ طریقہ ہی

لہ دیوان جی کے کچھ حالات کا ذکر پہلے کر چکا ہوں، دریافت کرنے پر مولانا محمد طیب صاحب نے یہ اطلاع دی ہے کہ یٰسین نام کے دو صاحبوں کا خصوصی تعلق سیدنا الامام الکبیر سے تھا، جن میں ایک تو یہی دیوان جی دیوبند کے رہنے والے تھے اور بقول مولانا طیب صاحب دیوبند میں حضرت والا کی خانگی اور ذاتی امور کا تعلق ان ہی سے تھا۔ لکھا ہے کہ صاحب نسبت بزرگ تھے۔ اپنے زمانہ مکان کے حجرے میں ذکر کرتے۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند فرمایا کرتے تھے کہ اس زمانہ میں کشفی حالت دیوان جی کی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ باہر سڑک پر آنے جانے والے نظر آتے رہتے تھے۔ در و دیوار کا حجاب ان کے درمیان ذکر کے وقت باقی نہیں رہتا تھا، ان ہی دیوان جی کے ایک مکاشفہ کا تعلق دارالعلوم دیوبند سے بھی بیان کیا جاتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ مثالی عالم میں ان پر منکشف ہوا کہ دارالعلوم کے چاروں طرف ایک سرخ ڈورا تنا ہوا ہے، اپنے اس کشفی مشاہدہ کی تعبیر خود یہ کیا کرتے تھے کہ نصرانیت اور تجدد و آزادی کے آثار ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم میں نمایاں ہوں گے۔ دارالعلوم کے کتب خانہ کے سب سے پہلے محرر بھی یہی دیوان جی تھے۔ بقول مولانا حبیب الرحمن دارالعلوم کا یہ وہ زمانہ تھا کہ دربان سے لیکر مہتمم تک سب کے سب صاحب نسبت تھے۔ دیوان جی بڑے تن و توش کے آدمی تھے، سیدنا الامام الکبیر کی مجلس میں باہر سے آنے والوں کو اکثر یہ دھوکا ہوتا کہ یہی حضرت نانوتوی ہیں۔ دوسرے صاحب اسی نام کے نانوتہ کے رہنے والے تھے۔ اور عجیب بات ہے کہ جب تک توطن کا تعلق نانوتہ سے حضرت کا رہا وہاں کے تمام خانگی کاموں کے متکفل یہی تھے۔

(ملاحظہ ہو بالکل اسی طرح کا بیان صفحہ ۲۸ (زیر نظر صفحہ ۳۹) (زیر نظر صفحہ ۴۰)

جس میں داخل ہونے کے بعد کام لینے والے نے آپ سے یہ مہمات انجام دلائے۔ بمشکل بیس تیس سال سے زیادہ مدت کی نہیں ہوتی۔ اسی محدود مدت میں حالات ہی کچھ ایسے پیش آئے کہ پے در پے، یکے بعد دیگرے، ایسے مہمات کی سرانجامی کے لئے قدرت کی طرف سے آپ کا انتخاب ہوا، جن کے آثار و نتائج، ثمرات و برکات سے نہیں کہا جا سکتا کہ مستقبل کی کتنی صدیاں متاثر و مستفید ہوتی رہیں گی۔

تاریخ ہند میں ۵۷ء کے ہنگامہ کے نام سے جو واقعہ مشہور ہے، کہنے والے اسی ہنگامے کو غدر کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں، اور کچھ دنوں سے آزادی کی پہلی جدوجہد کے عنوان سے بھی اب لوگ اس کا چرچا کرنے لگے ہیں۔ حساب سے سیدنا الامام الکبیر کی عمر اس وقت ۴۷ اور ۴۸ سال کے درمیان ہونی چاہئے، جیسا کہ معلوم ہے کہ ایک کم پچاس یعنی ۴۹ سال کی عمر میں پیمانۂ حیات آپ کا لبریز ہو گیا، اور یہ سارے کارنامے جن کی داستان اب سنائی جائے گی، چونکہ ان سب کا تعلق ۵۷ء والے ہنگامہ اور اس کے بعد کے زمانہ سے ہے، اس لئے سمجھنا چاہئے کہ بجائے خود ان کارناموں کی نوعیت کچھ ہی ہو، لیکن مدت اور زمانہ جس میں یہ ساری باتیں آپ سے بن آئیں، اور لینے والے نے جو کام آپ سے لیا، وہ یہی دس گیارہ سال کی محدود مدت اور محدود زمانہ ہے۔

قبل اس کے کہ کچھ آگے بڑھوں، بے ساختہ اس وقت بھی ظل میں اصل کی زندگی کا عکس معلوم ہوتا ہے کہ جھانک رہا ہے۔ ۶۳ سال کی زندگی میں وہاں بھی دیکھا گیا تھا کہ انسانی تاریخ کے رخ کو پھیر دینے والے واقعات مدنی زندگی کے دس سال کی محدود مدت ہی میں پیش آئے تھے۔ گویا اسی دس سال میں قیام قیامت تک اسلام کی بلکہ کہنے تو کہہ سکتے ہیں کہ انسانیت کے مستقبل کی تاریخ پوشیدہ تھی، صلی اللہ علیہ وسلم کھونے والے جس کی راہ میں اپنا سب کچھ کھوتے ہیں، دیکھ رہے ہیں، کن کن راہوں سے وہ کیا کچھ نہیں پاتے۔[1]

[1] اختیاری اور اکتسابی امور ہیں جن کے لئے پیروی سنت اور اتباع محبوب حقیقی کی دولت (باقی اگلے صفحہ پر)

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔ کہنا یہ ہے کہ ہندوستان کی مقامی حکومت کو ختم کرکے بیرونی اقتدار کے سیاسی تسلط کا جو واقعہ اس ملک میں پیش آیا تھا یعنی انگریزوں کی نئی حکومت اس ملک میں جو قائم ہوگئی تھی، ان انگریزوں اور ان کی حکومت سے سیدنا الامام الکبیر کے احساسات کا

(گذشتہ صفحہ سے) مقدر ہوتی ہے ان کے لئے تکوینی اور غیر اختیاری امور میں بھی مطابقۃ و مشابہۃ کا دروازہ پہلے ہی سے کھول دیا جاتا ہے، تاکہ ظل اور اصل میں خلقی اور اختیاری تطابق کی سعادت بہم پہنچادی جائے اور اصل کا پورا پورا عکس ظل میں نمایاں ہو جائے۔ مثلاً تمہید میں حضرت مؤلف سوانح دام مجدہ نے نانوتہ کی جغرافیائی صورت کھجوروں کے جھنڈ نانوتہ کو ڈھانپے ہوئے ہیں، مدینۃ النبی سے مشابہ دکھلائی ہے۔ دیوبند کی حالت قبل از ورود حضرت والا صاحب سوانح مخطوطہ نے انتہائی ظلم و جہل کی دکھلائی ہے جس کا تذکرہ تاسیس مدرسہ دیوبند کے ضمن میں آرہا ہے، جو اشبہ ہے زمانۂ جاہلیت کے۔ پھر حضرت والا کے ورود سے علم و عمل کا ماحول بن جانا اور کمال کی روشنی پھیل جانا دکھلایا ہے جو اشبہ ہے طلوع آفتاب رسالت کے، یہاں حضرت مؤلف سوانح دام مجدہ حضرت والا کی مدت اصلاح و تربیت دس سال دکھلارہے ہیں جو اشبہ ہے مدنی زندگی کے دس سال کے، اور حضرت شیخ المشائخ حاجی امداد اللہ صاحب نے حضرت والا کے ایک خاص قلبی حال (انتہائی ثقل کی وجہ سے زبان کے منوں وزنی ہو جانے) پر حضرت والا کو فرمایا کہ مبارک ہو، حق تعالیٰ آپ کو علوم نبوت سے سرفراز فرمائے گا جو حسب ارشاد حضرت حاجی صاحب اشبہ ہے ثقل وحی کے، پھر صاحب سوانح مخطوطہ نے نور نبوت کے زیر سایہ حضرت والا اور ان کے تین ساتھیوں مولانا محمد یعقوب صاحب مولانا رفیع الدین صاحب اور حاجی محمد عابد صاحب کو خلفاء اربعہ سے تشبیہ دیتے ہوئے دینی اصلاح کے عناصر اربعہ سے تعبیر فرمایا اور لکھا کہ حضرت والا حلم و کرم، رحمت و شفقت اور وفور علم میں نسبت صدیقی سے سرفراز تھے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب جلال و شدت میں نسبت فاروقی سے ممتاز تھے۔ مولانا رفیع الدین صاحب انکسار نفس اور حیا میں نسبت عثمانی سے مشرف تھے اور حضرت حاجی محمد عابد صاحب قوت فیصلہ اور اصابت رائے میں نسبت مرتضوی رکھتے تھے، نور نبوت کی تربیت کے زیر سایہ و زیر سرکردگی حضرت والا حق تعالیٰ نے ان ہی عناصر اربعہ سے تجدید و احیائے دین کا کام اس مدرسہ کے راستہ سے لیا۔ اس طرح حق تعالیٰ نے ظل میں اصل کا عکس ایک ہی جہت سے نہیں جہات متعددہ کو نمایاں فرمایا جس کا مرجع عالم تکوین میں حضرت والا کے کمال اتباع سنت اور کمال محبت نبوی کا۔ گویا اختیاری اتباع چونکہ آپکی سرشت میں خلقۃً ودیعت کر دیا گیا تھا جسے نمایاں ہونا تھا۔ اسلئے تکوینی طور پر حضرت والا کی طبیعت و فطرت ہی نہیں بلکہ آپ سے متعلقہ زمان و مکان اور احوال و سوانح نے بھی اصل کے متعلقات زمان و مکان اور احوال و سوانح کے عکس اتارنے کی سعادت پائی۔ کوئی جاہل یا معاند اس سے معاذ اللہ حضرت والا کیلئے نبوت کا اثبات یا عیاذاً باللہ نبی کی مساوات نہ سمجھ لے بلکہ نبوۃ کی انتہائی غلامی اور محکومی ہی یہ اختیاری اور تکوینی مشابہت صاحب تصنیف کو نصیب ہوئی ہے یہ برابری یا مساوات نہیں بلکہ انتہائی غلامی اور پیروی نبوۃ کی دلیل ہوتی ہے۔
محمد طیب غفرلہٗ

کی طرف سے کس کس قسم کے خیالات پیدا ہوتے رہتے تھے۔ آپ دیکھ رہے تھے کہ دنیا تو خیر ختم ہی ہو چکی، لے دے کر بچا کھچا سرمایہ مسلمانوں کے پاس دین کا رہ گیا ہے۔ سو بقول اکبر مرحوم ؎

نئی نئی آنچیں لگ رہی ہیں، یہ قوم بیکس پگھل رہی ہے

نہ مغربی ہے نہ مشرقی ہے عجیب سانچے میں ڈھل رہی ہے

خواص ہی نہیں، غدر سے پہلے ہی جیسا کہ سرسید مرحوم نے اپنے رسالہ بغاوت ہند میں لکھا ہے،

"رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچ گئی، کہ رعایا ہندوستان کی ہماری گورنمنٹ کو میٹھے زہر اور شہد کی چھری، اور ٹھنڈی آنچ کی مثال دیا کرتی تھی۔" صلا ۲۳ ضمیمہ حیات جاوید

"رعایا ہندوستان" کے عوام کے تاثرات کے متعلق سرسید مرحوم کی جب یہ شہادت ہے تو سمجھا جا سکتا ہے کہ حال سے مستقبل کے نتائج تک پہنچنے کی جتنی زیادہ بصیرت جن لوگوں میں تھی، ان ارباب فکر و نظر کا حال کیا ہوگا، یوں بھی جب یہ سب کچھ دیکھا جا رہا تھا کہ اصلی اور مصنوعی (یعنی دیسی) پادریوں کا ٹڈی دل، ہندوؤں اور مسلمانوں کے دھرم اور دین کے چاٹ جانے کے لئے ملک کے طول و عرض میں پھیلا ہوا ہے۔ سرکاری حکام خفیہ اور بسا اوقات علانیہ بھی، دام سے درم سے قدم سے ان پادریوں کی ہمت افزائیوں میں مشغول و منہمک نظر آ رہے تھے، مسلمانوں اور ہندوؤں کے دینی پیشواؤں کی تحقیر و توہین کا بازار ہر طرف گرم تھا، دین کے ان خطرات کے ساتھ ساتھ دنیا کا حال یہ تھا کہ بڑے بڑے راجہ اور والیان ملک نواب اور رئیس نان شبینہ کے محتاج بن کر گلی کوچوں میں ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ عوام کی غربت اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ بقول سرسید مرحوم ڈیڑھ آنہ یومیہ یا ڈیڑھ سیر اناج پر ہر ہندوستانی اپنی گردن کٹوانے پر بخوشی تیار ہو جاتا تھا۔ صنہ (بغاوت ہند)

یہ اور اسی قسم کے واقعات و حالات جن سے عام طور پر لوگ واقف بھی ہیں اور موقعہ موقعہ سے اس کتاب کے مقدمہ میں بھی، اصل کتاب میں بھی، ان امور کا تذکرہ کر چکا ہوں۔

اب اسی کے ساتھ جب ہم یہ سنتے ہیں، کہ فوج کی بغاوت عام کے بعد آگے پیچھے ہندوستان کے

مختلف علاقوں کے باشندے ہنگامہ غدر کی آگ میں جیسے کود پڑے تھے، اسی طرح سیدنا الامام الکبیر بھی عملاً اس میں شریک ہو گئے تھے۔ خود بھی شریک ہوئے اور آپ کے پیر و مرشد، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ، نیز آپ کے رفیق الدنیا و الآخرۃ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کش مکش میں حصہ لیا، تو بظاہر اس پر کوئی تعجب نہیں ہوتا۔ دارالعلوم دیوبند کے متوسلین عموماً اپنی مجلسوں میں اس کا تذکرہ بھی کرتے ہیں

واقعات و حالات سے بھی اسی کا پتہ چلتا ہے، اور لکھنے والوں نے جو اس زمانہ میں موجود تھے، انہوں نے بھی لکھا ہے کہ کسی باضابطہ اسکیم، یا لائحہ عمل کے تحت غدر کا یہ ہنگامہ پیش نہیں آیا تھا، اور نہ ہندوستان کی کسی خاص قوم یا کسی خاص طبقہ نے بغاوت ہے لئے، یا آزادی کی جد و جہد کا پروگرام بنایا تھا، بلکہ صحیح یہی ہے کہ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ میں کامیاب ہونے کے بعد، ہندوستان کی حکومت کا باضابطہ چارج لینے کا فیصلہ انگریزی قوم نے جب کر لیا اور سو سال کی طویل مدت میں ہندوستان کے باشندوں کو انگریزوں اور انگریزی حکومت کے طور و طریقہ، رنگ ڈھنگ، کے تجربے سے ان کے باطنی ارادوں کا پتہ جو کچھ بھی چلا، مجموعی طور پر سب سے ملک کے باشندوں میں بے زاری کے جذبات پرورش پاتے چلے جا رہے تھے، اس عرصہ میں انگریزی حکومت کا دائرہ بھی وسعت کی آخری حد تک پہنچ گیا۔ برہما سے سرحد کابل و قندھار، اور نیپال سے راس کماری تک کا کوئی خطہ ایسا باقی نہ رہا جس پر بالواسطہ یا بلا واسطہ انگریز قابض و دخیل نہ ہوں۔ فتوحات کی اس عجیب و غریب وسعت میں بجائے گوروں کی پلٹن کے ہندوستان کی کالی پلٹن کے اخلاص و جاں نثاری اور بہی خواہی کے ایسے حیرت انگیز تجربات انگریزوں کو ہوئے کہ گوری پلٹن کی گراں فوج کے مقابلہ میں کالی پلٹن کی ارزانی پر بھروسہ کر کے ہر فوج میں کالوں کو اکثریت حاصل ہو گئی، حق نمک جس سے گورے ناآشنا تھے۔ ہندوستانی فوج اسی نمک کی کان انگریزوں کو نظر آئی، دوسری طرف کالی پلٹن اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی کہ جنگ کے جدید حربی آلات کی جگہ یہ سمجھنے لگی کہ اپنی کثرت تعداد سے انگریزوں کو

ہم لوگوں نے اتنے ممالک فتح کر کے حوالہ کر دیئے ہیں، اور تو کچھ نہیں لیکن اس احساس نے کالی پلٹن کے نازنخروں کے سمندر پر تازیانہ کا کام کیا۔ کالی پلٹن کا یہ بھی ایک نخرہ تھا کہ چربی ملے ہوئے کارتوس کو دانتوں سے نہیں کاٹیں گے۔ وہ تو خریداروں پر اپنا ناز دکھا رہے تھے، لیکن تقدیر نے اسی ناز کو نار بنا دیا۔ انگریز کچھاڑ گئے، غرور تو کالوں کے دماغ میں بھر ہی گیا تھا، اٹھکھڑے ہوئے، اور وہی ہندوستانی فوج جو خود مار لیعنی پیچ پی کر اپنے گورے افسروں کو چاول کھلانے پر اصرار کرتی تھی، انگریزوں ہی کو نہیں، بلکہ ان کے بچوں، اور ان کی عورتوں کو اس طریقے قتل کرنے لگی، کہ گویا وہ انسان نہ تھے۔ فوج جب باغی ہو گئی، تو ملک کے عام باشندے جو سو سال کے اس عرصہ میں انگریزی حکومت سے تنگ آ چکے تھے۔ ان کے سامنے بھی نجات کی ایک صورت آ گئی، مختلف علاقوں کے برباد اور تباہ ہونے والے خاندانوں میں بھی کچھ ابال آیا، کچھ غنڈوں شہدوں کو بھی لوٹ مار کا موقعہ مل گیا، یوں مل ملا کر وہ صورت پیش آئی، جسے چاہے آپ غدر و بغاوت کہئے، چاہے اس کا نام آزادی کی جد وجہد رکھ دیجئے۔ اس میں ہندو مسلمان اور دونوں قوموں کے چھوٹے بڑے عوام وخواص سب ہی طرح کے لوگ شریک تھے لیکن با ایں ہمہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جیسے پہلے کوئی لائحہ عمل، لوگوں کے سامنے نہ تھا، بعد کو بھی ضبط ونظم کے قائم کرنے کا عام طور پر نہ لوگوں کو خیال ہی ہوا، اور وقتی طور پر کہیں کچھ کیا بھی گیا تو حد سے زیادہ بے جان مضمحل، گسستہ وشکستہ تھا۔

جب سب سے بڑے مرکز، جسے فوجیوں نے بھی سب سے بڑا مرکز بنایا تھا، یعنی دلّی یہاں کا نظم وضبط جس کے دل ودماغ کے سپرد کیا گیا تھا۔ یعنی سراج الدین ظفر شاہ مرحوم سید احمد خاں ان کے دربار کے خطاب یافتہ درباری آدمی تھے، میں نہیں سمجھتا ہوں کہ یہ الفاظ ظفر شاہ کے متعلق ان کے قلم سے جو نکلے ہیں، بے بنیاد ہیں، لکھتے ہیں کہ

"ہمیشہ خیال کرتا تھا کہ میں مکھی اور مچھر بن کر اڑ جاتا ہوں، اور لوگوں کے ملکوں کی خبر لے آتا ہوں، اور اس بات کو اپنے خیال میں سچ سمجھتا تھا، اور درباریوں سے

بے زار بناتی چلی جا رہی تھی۔ جن لوگوں میں بصیرت و دانائی کی روشنی جتنی زیادہ تھی، اسی حد تک نفرت اور بے زاری کے جذبات بھی ان کے شدید سے شدید تر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس باب میں سیدنا الامام الکبیر کے قلب مبارک کی گہرائیاں جیسا کہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے، حد سے گذری ہوئی تھیں مولانا طیب الحفید سلمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک یادداشت میں لکھا ہے کہ غدر کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی نقاب اتار کر براہ راست انگریزی قوم نے ہندوستان کی حکومت کا جائزہ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور ملکہ وکٹوریہ کو ہندوستان کی قیصر بنا کر دلی میں ملکہ کی تاج پوشی کا جشن منانے کا فیصلہ کیا گیا، اس زمانہ میں سیدنا الامام الکبیر کا قیام دہلی میں تھا۔ لیکن جوں ہی کہ اس جشن کے انعقاد کا ساز و سامان ہونے لگا، دیکھا گیا، جیسا کہ مولانا طیب صاحب فرماتے ہیں۔

"حضرت نانوتوی دہلی سے دیوبند چلے آئے، اور فرمایا کہ مجھ سے انگی (انگریزوں) کی شوکت نہیں دیکھی جاتی، اس لئے دہلی سے دیوبند چلا آیا کہ نہ دیکھوں گا، نہ کوفت ہوگی۔" (سیاسی یادداشت صہ ۲)

ظاہر ہے کہ کسی قوم اور حکومت کی طرف سے دل گرفتگی کی یہ آخری شکل ہو سکتی ہے لیکن یہی موقعہ پر آگے مولانا طیب صاحب کی اس روایت میں ایک اضافہ بھی ہے۔ اسی اضافہ کی طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں، لکھا ہے کہ

"نیز فرمایا کہ الحمد للہ اتنی طاقت تو ہے کہ سارا دربار درہم برہم کر دوں، مگر سنبھالنے والے نظر نہیں آتے، اس لئے دہلی چھوڑ کر چلا آیا، کہ نہ ان کا کروفر دیکھوں گا، نہ کوفت و سوخت ہوگی۔" صہ ۳

حضرت والا کی طرف جس دعوے کو اس اطلاع میں منسوب کیا گیا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ دربار کے درہم و برہم کر دینے کے جس امکان اند طاقت کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے۔ کیا دعا و ہمت کی روحانی اور باطنی قوت کے امکانات کی طرف اس دعوے میں اشارہ کیا گیا ہے؟

بظاہر اول وہلہ میں ممکن ہے ذہن اسی کی طرف منتقل ہو جائے۔ لیکن اس راہ میں سیدنا الامام الکبیر کے ستر واخفا کی غیر معمولی کوششوں سے جو واقف ہیں، اگر سوچیں گے، تو یقیناً ان کو عجب نہیں تو یہ بات خلاف دستور ضرور معلوم ہو گی، جہاں تک میں جانتا ہوں یا دوسروں سے سنا ہے، ناگزیر مجبوری کے بغیر اپنی زندگی کے اس باطنی پہلو کی ہوا بھی چاہتے تھے، کہ کسی کو نہ لگنے پائے۔

اسی لئے میں تو سمجھتا ہوں کہ اپنے رسالہ اسباب بغاوت ہند میں سر سید مرحوم نے انگریزوں کے دور از کار وسوسوں کا ازالہ کرتے ہوئے اپنی اس رائے کا جو اظہار کیا ہے، کہ

"میری رائے میں کبھی مسلمانوں کے خیال میں بھی نہیں آیا، کہ باہم متفق ہو کر غیر مذہب کے حاکموں پر جہاد کریں"

بلکہ فوج کے متعلق بھی اپنا ذاتی احساس انہوں نے ظاہر کیا ہے۔

"فوج میں بھی ہرگز مشورہ اور پہلے سے صلاح نہ تھی"

اور وہی جو یہ اطلاع دیتے ہیں کہ "جہاد کے فتوی" کے نام سے باغیوں نے جس فتوے کو مشہور کیا تھا، اس پر علماء کے دستخط زیادہ تر جعلی تھے۔ حتیٰ کہ وہی لکھتے ہیں کہ

"ایک آدھ مہر ایسے شخص کی چھاپ دی گئی تھی جو قبل غدر مر چکا تھا" ص۱۹

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی مستند سوانح عمری تذکرۃ الرشید کے حاشیہ میں جو خبر

---

[۱] ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کا قصہ جب میدان کارزار سے نکل کر سرکاری تحقیقات کاروں اور کالج کے پروفیسروں استادوں کے سامنے آیا، تو کسی کو اس کی جڑ روس میں نظر آتی تھی۔ ایک صاحب کو ولی عہد ایران کے خیمہ میں کاغذ مل گیا تھا، جس میں بیرونی تسلط کے مصائب کو بیان کرتے ہوئے ایرانیوں کو ہندوستان کے حال سے عبرت پذیر ہونے کی وصیت کی گئی تھی، اسی کاغذ کو بنیاد بنا کر بعض کہتے تھے کہ سرچشمہ بغاوت کا ایران میں تھا، خدا جانے ہندوستانیوں نے کسی وبا وغیرہ کے مقابلہ میں بطور ٹوٹکہ کے گاؤں گاؤں میں روٹیاں بانٹی تھیں، سمجھا گیا کہ ان روٹیوں پر بغاوت کا پیغام لکھا ہوا تھا۔ لوگ ان کو چٹ کر چکے تھے۔ یہ چپاتیاں ۱۸۵۶ء میں تقسیم ہوئی تھیں، اور بھی طرح طرح کی بدخوابیاں تھیں، جن میں مدتوں انگریز مبتلا رہے۔ تفصیل کے لئے غدر کے لٹریچر کا مطالعہ کیا جائے۔ ۱۲

دی گئی ہے کہ

"سنایا گیا ہے کہ ہمارے اکثر دینی حضرات نے اس کارروائی سے منع کیا" ج اول ص۲۶

یہ یا اسی قسم کی باتیں کتابوں میں جو ملتی ہیں، ان کو محض وقتی مصلحت اندیشیوں کا نتیجہ قرار دے کر خواہ مخواہ اس پر اصرار کرنا کہ کسی باضابطہ پروگرام کو طے کر کے آزادی کی یہ جدوجہد ہندوستان میں شروع ہوئی تھی، شاید درست نہ ہوگا، بلکہ واقعہ کی صحیح نوعیت وہی معلوم ہوتی ہے اگر ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی کے جیت لینے کے بعد سو سال تک انگریزی حکومت کے مسلسل تجربات ہندوستانیوں میں بے زاری کی آگ کو بھڑکاتی چلی جا رہی تھی، ایک اندرونی زخم تھا جو اندر ہی اندر شعوری و غیر شعوری طور پر پکتا چلا جا رہا تھا۔ تا اینکہ ٹھیک سو سال کے بعد ۱۸۵۷ء میں چربی ملے ہوئے کارتوسوں کا قصہ منہ بن گیا، زخم پھٹ گیا، دبے ہوئے شعلے بھڑک اٹھے، چونکہ کسی باضابطہ نظام کے تحت اقدام نہیں کیا گیا تھا۔ افراتفری پھیل گئی۔ ایک علاقہ کی سن کر دوسرے علاقہ والوں میں تو چل میں چل کی کھلبلی مچ گئی، پھر جو کچھ ہونا تھا، ہوا، چاہے اسے نوشتۂ تقدیر کہئے، یا زشتیِ اعمال کا قدرتی نتیجہ قرار دیجئے۔ ایک ہندو مورخ راجہ شیو پرشاد نے اپنی آنکھوں سے دلی میں جو کچھ اس نے دیکھا تھا، اور کتابوں میں "زشتیِ اعمال" کی نادری صورت کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ دونوں ہی کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے، کہ

"یہ سانحہ نادر شاہی سے بھی بڑھ کر ہوگیا"[۱] ص۱۲۷

خصوصاً روایت کے جو الفاظ ہیں ان میں بجائے اس باطنی پہلو کے کافی گنجائش اس بات کی بھی

---

[۱] عجیب بات ہے کہ نادری بے چارہ اب تک بدنام ہے، یوں بھی تو سوچنا چاہئے کہ قتلِ عام جو نادرہ کے حکم سے دلی میں ہوا، مورخین کا بیان ہے کہ نصف روم سے آگے نہ بڑھا۔ سیر المتاخرین میں ہے "چوں نصف روز بگذشت، نادر شاہ ندا لے لمان بقیۃ السیف در داد و لشکریاں دست کوتاہ کردند" ص۵۴۹ ج۲ لیکن دلی پر قابض ہو جانے کے بعد ایام غدر میں شیو پرشاد کا بیان ہے کہ ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸ ستمبر ۱۸۵۷ء یعنی چار دن تک مسلسل دلی کی گلی کوچوں میں قتلِ عام کا بازار انگریزوں کی طرف سے گرم رہا۔ آدھا دن کے قتلِ عام اور چار دن کے قتلِ عام میں خود سوچنا چاہئے کوئی نسبت ہو سکتی ہے ۱۲

ہے اگر اس امکان کو ظاہری اسباب پر محمول کیا جائے یہ سیدنا الامام الکبیر اپنے اثر اور رسوخ کے لحاظ سے جو کچھ کر سکتے تھے، اس کو تو جانے دیجئے۔ اس قسم کے رنگ میں بھنگ جب مشاہدہ بتا رہا ہے کہ معمولی بم پھینکنے والے ہنگامی دہشت پسند بھی ڈال سکتے تھے، اور لارڈ ہارڈنگ کے ساتھ اسی دلّی میں جشن ہی کے موقعہ پر درہمی اور برہمی کے جس تماشے کو دیکھا گیا تھا، اس کے دیکھنے والے تو اب بھی مل سکتے ہیں یوں بھی اصولاً تعمیر کے مقابلہ میں تخریب کا مسئلہ چنداں دشوار بھی نہیں ہے۔ بلکہ آگے جو یہ فرمایا گیا ہے کہ

"مگر سنبھالنے والے نظر نہیں آتے"

خود یہ بھی بتا رہا ہے کہ اسباب و علل کے جس عمومی نظام کے تحت دنیا چل رہی ہے سیدنا الامام الکبیر کے سامنے اللہ کی یہی سنت اور قدرتی کارفرمائیوں کا یہی عام پہلو تھا، حاصل گویا یہ سمجھنا چاہئے کہ حکومت مسلّطہ کے ختم کر دینے یا کم از کم اس کے نظام کو الٹ پلٹ دینے کے امکانات کو پاتے ہوئے بھی، سیدنا الامام الکبیر یہ محسوس فرماتے تھے کہ اس تخریب کے بعد تعمیر کی دشواریوں پر قابو حاصل کرنے کے لئے عام سنت اللہ کی رو سے جن ناگزیر ضمانتوں اور اسباب و شروط کی ضرورت ہے ان سے اس زمانہ کا ماحول خالی اور مفلس نظر آ رہا تھا، اور یہی چیز تھی، جو تخریبی امکانات سے فائدہ اٹھانے میں مزاحم ہو جاتی تھی، ملک اس زمانہ میں جس حال میں تھا، عوام و خواص جس رنگ میں رنگین تھے جس نے حکیمانہ بصیرت کے ساتھ ان کا مطالعہ کیا ہے، وہ اسی نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے، ظفر شاہ اور اسی عہد کے بعض دوسرے حکمرانوں کے متعلق نوٹ میں جو معلومات درج کی گئی ہیں، کم از کم وہی اس دعوے کی توجیہ کے لئے کافی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ مولٰنا طیب صاحب کی یہ روایت اگر صحیح ہے، اور نہ صحیح ہونے کی بظاہر کوئی وجہ معلوم بھی نہیں ہوتی، تو خود یہی اس بات کی کافی شہادت ہے، کہ ۵۷ء کے ہنگامہ میں آپ کی شرکت کسی باضابطہ سوچے ہوئے لائحہ عمل کا

یقیناً بے معنی اور بلا وجہ نہ تھی۔ خدا جزا خیر دے مولانا طیب صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کو کہ

"مگر سنبھالنے والے نظر نہیں آتے"۔

ان حقیقت افروز الفاظ پر مشتمل روایت کو بہت سی ذہنی الجھنوں کے سلجھانے کا سامان انہوں نے مہیا فرما دیا ہے۔

بلکہ سچ تو یہ ہے، کہ مصنف امام نے اسی غدر کے ہنگامہ کے متعلق اس کا ذکر کرتے ہوئے کہ سرکار میں اس کی مخبری کی گئی تھی، کہ حکومت سے بغاوت کے اس قصہ میں وہ بھی شریک تھے، آگے جو یہ ارقام فرمایا ہے، کہ

"مولانا فسادوں سے کوسوں دور تھے، ملک ومال کے جھگڑے اگر سر رکھتے، تو یہ صورت ہی کیوں ہوتی، کہیں کے ڈپٹی، یا صدر الصدور ہوتے"۔ ص ۱۹

اسی طرح حضرت گنگوہی بھی غدر ہی کے مجرموں میں ماخوذ ہوئے تھے اور کچھ دن جیل میں گذارنے کے بعد رہائی ہوئی تھی، اس واقعہ کی تفصیل کرتے ہوئے، مولوی عاشق الٰہی صاحب نے حضرت گنگوہی کی سوانح عمری تذکرۃ الرشید میں بجنسہ ان ہی الفاظ کا تقریباً اعادہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"یہ کمبل پوش، فاقہ کش، نفس کش حضرات فسادوں سے کوسوں دور تھے، ملک ومال کے جھگڑے اگر سر رکھتے، تو یہ صورت ہی کیوں ہوتی، کوئی کہیں کا ڈپٹی اور کوئی کسی جگہ کا صدر الصدور، کچہری کے عالی شان کمرے، اور عدالت کے وسیع اور اونچی چھتوں والے مکانات کو چھوڑ کر قبر کی تنگی یاد دلانے والوں حجروں اور کھرے بوریا کے فرش والے تاریک گوشوں میں کیوں پڑتے"۔

ص ۷۶/۱ تذکرۃ الرشید

خصوصاً خط کشیدہ الفاظ دونوں حضرات کے ایک ہی ہیں۔ واقعات سے جو واقف ہیں، اور سچ پوچھئے، تو ان حضرات کی عملی شرکت کا واقعہ کوئی راز درون خانہ تھا بھی نہیں، "محفلہا" میں جو بات طے ہوئی ہو، اور کی گئی ہو، راز بن کر وہ کیسے رہ جاتی، اسی کا نتیجہ ہے، کہ دونوں حضرات کے

اس بیان کو عموماً لوگ وقتی مصالح کا اقتضاء قرار دے کر دل میں سمجھ لیتے ہیں، کہ واقعہ کی تعبیر میں "توریہ" کے اس طریقہ کو اختیار کیا گیا ہے جس کی شرعاً و اخلاقاً سمجھا جاتا ہے کہ اجازت ہے، ایک حد تک یہ صحیح بھی ہے، لیکن اگر غور کیجئے، تو واقعہ کی تعبیر کا عام پیرایہ بھی شاید یہی ہو سکتا تھا۔ سب سے زیادہ مستحق توجہ مذکورہ فقروں میں

"فسادوں"

کا لفظ ہے۔ دونوں حضرات انکار اس کا کر رہے ہیں کہ "فساد" کی شرکت سے دونوں حضرات بری تھے۔ آخر قرآن مجید ہی میں جب فرمایا گیا ہے کہ

تلک الدار الآخرۃ نجعلها للذین لا یریدون علوا فی الارض ولا فسادا	یہ دار آخرت ہم ان ہی کیلئے رکھینگے جو زمین میں بگاڑ اور تکبر نہیں کرتے

اور ایک اسی ایک آیت میں کیا آپ قرآن پڑھئے، شروع سے آخر تک تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ایسی آیتیں آپ کو مسلسل ملتی چلی جائیں گی، جن میں زمین پر فساد اور بگاڑ پیدا کرنے والوں اور ان کے مفسدانہ کاروبار پر زجر و توبیخ انتہائی سخت اور کرخت لہجوں میں کی گئی ہے۔

پس ایسے بدترین قرآنی جرم' سے براءت کا دعویٰ اگر کیا گیا ہے، تو آپ خود سوچئے' کہ اس کے سوا اور کیا کیا جاتا' اسی لئے بجائے "توریہ" کے میرے نزدیک تو واقعہ کے اظہار کا یہ سیدھا سادہ طریقہ ہے' اور یہی سوچنے کی بات ہے' کہ "فساد" جس کی نفی کی گئی ہے' اس سے کیا مراد ہے۔ اور شرکت کا واقعہ جو یقیناً واقعہ ہے' اس کی صحیح نوعیت کیا تھی۔ اور اب میں اسی مسئلہ پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر اور آپ کے رفقاء خاص نے اس مہم میں یقیناً حصہ لیا تھا۔

اس سلسلہ میں آئندہ جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں اس سے پہلے ایک بات سن لی جائے جن معلومات کی روشنی میں نتیجہ تک پہنچنے اور پہنچانے کی کوشش کروں گا' ان کا بڑا حصہ (لیں)

کتابوں سے ماخوذ ہے جو عموماً رستخیز، دار و گیر کی اس قیامت کے بعد لکھی گئی ہیں، جسے غدر کے بعد انگریزی قوم کے مجنونانہ انتقامی جذبات نے اس ملک میں برپا کر رکھا تھا۔ ع

بات پر یاں زبان کٹتی ہے،

صرف شاعری نہیں، بلکہ اس عہد میں واقعہ بھی یہی گذر رہا تھا۔ اس روح فرسا جاں گداز حادثہ فاجعہ پر بیس اکیس سال بھی نہیں گذرے تھے جب ہمارے مصنف امام نے اپنی کتاب مرتب فرمائی تھی، ان کے بعد مولٰنا عاشق الٰہی صاحب مرحوم نے حضرت گنگوہی کی سوانح عمری مدون کی اب تغیر کافی ہو چکا تھا، اسی لئے بہت سی باتیں جو مصنف امام کی کتاب میں مجمل تھیں، مولٰنا عاشق الٰہی کی کتاب میں ان کی تفصیل کا موقعہ میسر آیا، سوانح مخطوطہ کے نام سے سیدنا الامام الکبیر کی جس غیر مطبوعہ ناقص سوانح عمری کا ذکر کرتا چلا آیا ہوں، صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ مصنف امام سے پہلے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ یا اس کے بعد تصنیف ہوئی[۱]، تاہم اتنا یقینی ہے کہ بزن و بکش زد و برد، دھر پکڑ، گنج کاؤ، کا سلسلہ حکومت کی طرف سے ختم نہیں ہوا تھا، بظاہر اسی کا نتیجہ یہ معلوم ہوتا ہے، کہ اس کتاب میں سرے سے اس واقعہ کے متعلق خاموشی اختیار کی گئی ہے[۲]، صرف ایک موقعہ پر دار العلوم دیوبند کی تاسیس کے تذکرے میں

---

[۱] سوانح مخطوطہ ۱۲۹۰ھ میں لکھی گئی ہے۔ جبکہ سیدنا الامام الکبیر کی وفات پر ایک سال گذر چکا تھا۔ چنانچہ بناء مدرسہ دیوبند کے سلسلہ میں خود سوانح مخطوطہ سے ہی یہ اقتباس پیش کیا گیا ہے۔ جیسا کہ آگے آئے گا، اور مصنف امام کی سوانح اس سے مقدم ہے جو سیدنا الامام الکبیر کے سن وفات ۱۲۹۷ھ ہی میں لکھی گئی ہے جیسا کہ اس سوانح کے اس قدیم نسخہ کے ٹائیٹل سے معلوم ہوتا ہے، جو مطبع صادق الانوار بھاولپور میں طبع ہوا ہے اس نسخہ کے ابتدائی بوسیدہ اور دریدہ اوراق میرے پاس محفوظ ہیں۔ محمد طیب

[۲] جہاں تک احقر کا اندازہ ہے سوانح مخطوطہ میں اس مسئلہ سے خاموشی اختیار نہیں کی گئی۔ بلکہ صراحۃً و کنایۃً اس کا تذکرہ بھرپور الفاظ میں کیا گیا ہے۔ صراحتاً جن اوراق میں حضرت والا کے مجاہدانہ کارناموں اور غزا کا ذکر ہے۔ وہ اوراق غائب ہیں۔ مگر فہرست مضامین میں اس کا مستقل عنوان رکھ کر ان اوراق اور اس تذکرہ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جسے سکوت نہیں کہا جا سکتا۔ پھر اس اقتباس میں بھی جو حضرت مؤلف سوانح دام مجدہ نے فرمایا ہے۔ یہ تذکرہ مثل صراحت کے ہے۔ کیونکہ اس اقتباس سے تاسیس مدرسہ کا زمانہ ہندوستان کی اس قیامت کبریٰ کا زمانہ ہے۔ جس میں ہنگامہ ۵۷ء کے پس منظر کے طور پر دار و گیر اور زن و کش کے حوادث رونما تھے۔ اور خود حضرت مؤلف سوانح ہی کا بیان آگے آرہا ہے۔ کہ مسئلہ بناء دار العلوم کے سلسلہ میں، باقی اگلے صفحہ پر

یہ لکھتے ہوئے کہ

"یہ وہ زمانہ ہے' جس میں ملک ہندوستان میں ایک ہنگامہ سخت برپا ہوا تھا' جس کو عوام الناس غدر کہتے ہیں"

ضمناً اتنی بات ان کے قلم سے بھی نکل پڑی ہے۔

اور یہ وہ معرکہ تھا' جس میں ملک ہندوستان میں شوکت اسلام بالکل زائل ہو گئی تھی' اور مغلیہ سلطنت کے جسم کی جان نکل گئی تھی' اور کارخانہ اسلام کا تہ وبالا ہو گیا تھا۔ مسلمان ہونا ہی جرم ہو گیا تھا۔ اکابر دین کا خاتمہ ہو گیا تھا' ہر مسلمان سراسیمہ حال تھا' ہر مومن شکستہ بال تھا۔ ہندوستان میں ایسی گہری اندھیری چھائی تھی۔ نہ میں تجھ نہ تو مجھ کا حال تھا' یا نفسی نفسی کا مقال تھا۔ جتنا جو بڑا تھا' اتنا ہی بڑا اس پر صدمہ تھا۔ اکثر اکابر دین جنت الفردوس کو سدھارے' اور بعض بعض جو پنجۂ اجل سے بچے' اس ملک سے ہجرت فرما گئے' ہندوستان میں اسلام پر قریب قریب اسی کے صدمہ عظیم واقع ہوا تھا' جیسے حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریف پر کل اسلام پر۔ مسلمانوں کی قلت کفار کی کثرت' کفر کی شدت بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب یہ دین نسیاً منسیاً ہو جائے گا" ص ۳۰

اس میں شک نہیں کہ جس زمانہ میں وہ لکھ رہے تھے۔ اس وقت اتنا بھی لکھ دینا غیر معمولی ایمانی قوت' اور اسلامی حمیت کے بغیر آسان نہ تھا۔ مگر یہ بات کہ جس شخص کی سوانح نگاری کا

(گذشتہ صفحہ) اگر ان سے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مدرسہ دیوبند کو استاد رحمۃ اللہ علیہ نے کیا محض تعلیم کے لئے قائم کیا تھا؟ نہیں' بلکہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی ناکامی کی تلافی کے لئے جس سے حضرت کا ان واقعات میں دخل نمایاں ہے۔ بہرحال سوانح مخطوط کی فہرست میں حضرت کے جہاد کا عنوان اور واقعات جہاد کی سرخیاں اور اس اقتباس میں ۵۷ء کا پس منظر اور اس میں تاسیس دارالعلوم کی صورت سے حضرت والا کا عزم و مقصد اسی کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں کہ حضرت والا کی شرکت بھی اس میں اپنے مقاصد کے تحت ہوئی اور سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اس کے اظہار و اندراج سے سکوت و اغماض بھی نہیں کیا۔

محمد طیب غفرلہٗ

فرض وہ انجام دے رہے ہیں۔ اس کا بھی نفیاً یا اثباتاً اس ہنگامہ سے کسی قسم کا کوئی تعلق تھا، یا نہیں، نہ یہ سوال ہی اٹھایا گیا ہے، اور نہ صراحۃً یا کنایۃً جواب ہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ البتہ ایک جگہ سیدنا الامام الکبیر کی غیر معمولی جامعیت کا تذکرہ کرتے ہوئے عالم عابد حافظ حاجی وغیرہ عنوانوں کے ساتھ

"غازی" ؎۱

کے عنوان کو بھی ہم پاتے ہیں، لیکن غزا کے اس فرض کو کب کہاں، کس شکل میں، کن حالات میں انجام دے کر "غازی" کے اس لقب کے آپ حقدار ہوئے۔ کتاب کا جتنا حصہ میرے پاس ہے۔ اس میں تو اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا۔

بہرحال مصنف امام کی کتاب، اور حضرت گنگوہی کی سوانح عمری تذکرۃ الرشید جسے مولانا عاشق الٰہی نے مرتب فرما کر جماعت دیوبند کے ذمہ دار بزرگوں کی خدمت میں پیش کی، اور کافی تنقیح و تحقیق کے بعد یہ کتاب شائع ہوئی، اس وقت تک کسی قسم کی تنقید اس کتاب کی روایتوں پر جہاں تک میں جانتا ہوں نہیں کی گئی ہے، ان دو مطبوعہ کتابوں کے سوا مولانا طیب صاحب، اور مولانا طاہر صاحب سیدنا الامام الکبیر کے دونوں سعید و رشید ثقہ پوتوں کی قلمی یادداشتوں کی معلومات کو پیش نظر رکھ کر اس سلسلہ میں واقعات کی جو ترتیب میری سمجھ میں آئی ہے اسے قلم بند کرتا ہوں؎۲، واللہ ھو الملھم للصواب والیہ المرجع والمآب تمہیداً آغاز غدر کے بعض اجمالی پہلوؤں کا ذکر مناسب ہوگا۔

؎۱ ۱۹۴۹ء میں مولانا طیب صاحب نے کابل کا مشہور سفر جب کیا تھا اور شاہ کابل ظاہر شاہ انار اللہ برہانہ کی ملاقات، بلکہ مصافحہ اور معانقہ کے بعد ہم کلامی کا موقعہ بھی مولانا کو میسر آیا تھا، بڑے بڑے وزرائے شبستان فارسی کے چشم و چراغ کو اپنے سروں اور آنکھوں پر بٹھایا۔ ظاہر شاہ کے والد نادر شاہ مرحوم کے پاس سیدنا الامام الکبیر کی ایک ٹوپی بطور تبرک محفوظ تھی۔ یہ ٹوپی ان کے یہاں اس وقت پہنچی تھی جب ان کا خاندان ہندوستان ہی میں مقیم تھا، دستور تھا اور شاید اب تک ہے کہ اس شاہی خانوادہ میں کوئی جب بیمار پڑ جاتا ہے تو شفا کی نیت سے یہ ٹوپی اسے پہنائی جاتی ہے۔ غالباً نادر شاہ کی والدہ یا دادی نے (باقی اگلے صفحہ پر)

ان کی تاریخ کے اس فقرے کا یعنی

"دہلی اور لکھنؤ کے ٹوٹتے ہی باغیوں کی کمر ٹوٹ گئی" ص ۱۲۹ جام جہاں نما

جس کا مطلب بھی یہی ہے۔

یہ اتفاق کی بات تھی کہ مقابلہ سب سے زیادہ ان ہی دونوں مقامات میں ہوا، اور کش مکش بھی سب سے زیادہ طویل ان ہی دونوں مقامات کی تھی۔ کافی وقفہ اسی لئے سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کا ان لوگوں کو مل گیا۔ جو عوام کے بھیڑ یا دھسان میں ابتدا ہی سے شریک نہیں ہوئے تھے، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس ہنگامہ میں شریک ہونے والوں میں ایک طبقہ تو ان لوگوں کا تھا، جن کے لئے "ہو" کی آواز بس تھی، ہندو اور مسلمان دونوں ہی طرح کے مورخین کی کتابوں میں اس قسم کی باتیں جو ملتی ہیں۔ مثلاً راجہ شیو پرشاد نے لکھا ہے کہ

"اس عرصہ میں ہزار ہا قیدی چھٹے، اور انہوں نے شہر اور چھاؤنی کے لچے بدمعاش

(گذشتہ صفحہ سے) وقت پر انگریزوں کو میسر آتی تو کہنے والے کہتے ہیں کہ لکھنؤ کا سقوط آسان نہ تھا۔ رزیڈنسی کی کوٹھی، بیلی گارڈ کے در و دیوار میں بھی جدوجہد کرنے والوں کی نشانیاں محفوظ ہیں۔ اس موقعہ پر بے ساختہ جی چاہ رہا ہے کہ ایک سنی ہوئی بات کا ذکر کردوں، اگرچہ اب نہ ان باتوں کے سننے والے ہی رہ گئے ہیں اور نہ ماننے والے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی صدر الصدور سرکار آصفیہ قدس اللہ سرہ سے ایک دفعہ نہیں مختلف موقعوں پر یہ بات فقیر نے سنی تھی کہ انگریزوں کے مقابلہ میں جو لوگ لڑ رہے تھے، ان میں حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ بھی تھے۔ اچانک ایک دن مولانا کو دیکھا گیا کہ خود بھاگے جا رہے ہیں اور کسی چودھری کا نام لے کر جو باغیوں کی فوج کی افسری کر رہے تھے کہتے جاتے تھے کہ لڑنے کا کیا فائدہ خضر کو تو میں انگریزوں کی صف میں پا رہا ہوں۔ نواب صاحب ہی دوسرے واقعہ کا ذکر بھی فرماتے تھے کہ غدر کے بعد جب گنج مرادآباد کی ویران مسجد میں حضرت مولٰنا جاکر مقیم ہوئے تو اتفاقاً اسی راستے سے جس کے کنارے مسجد ہے کسی وجہ سے انگریزی فوج گذر رہی تھی، مولٰنا مسجد سے دیکھ رہے تھے، اچانک مسجد کی سیڑھیوں سے اتر کر دیکھا گیا کہ انگریزی فوج کے ایک سائیس سے جو بگ ڈٹ گھوڑے وغیرہ کا ملٹی ہوئے تھا اس سے باتیں کرکے پھر مسجد واپس آگئے۔ اب یاد نہیں کہ پوچھنے پر یا خود بخود فرمانے لگے کہ سائیس جس سے میں نے گفتگو کی یہ خضر تھے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا حال ہے تو جواب میں کہا کہ حکم یہی ہوا ہے۔ یہ روایت نواب صاحب سے سنی ہوئی ہے۔ باقی خود خضر کا مطلب کیا ہے؟ نصرت حق کی خیالی شکل تھی جو اس نام کر ظاہر ہوتی ہے تفصیل کیلئے شاہ ولی اللہ وغیرہ کی کتابیں پڑھئے گویا جو کچھ دیکھا جا رہا تھا اسی کے باطنی پہلو کا یہ مکاشفہ تھا ۱۲

جو بھی ان سے واقف ہوگا، وہ میری ہمنوائی پر انشاء اللہ اپنے آپ کو مجبور پائے گا۔ اب خاص ترتیب سے اپنی ان معلومات کو پیش کرتا ہوں۔

۱

آپ مجھ سے یہ سن چکے کہ میرٹھ میں کارروائی کا آغاز ۱۸۵۷ء کی ۵ ر مئی سے ہوا۔ رمضان[1] کی دسویں تاریخ تھی۔ اسی لئے لکھا ہے کہ کھلی چاندنی میں لوگ میرٹھ سے دہلی روانہ ہوئے۔ خیر یہ بات تو تاریخ بتاتی ہے۔ اب سنئے، مصنف امام نے اپنی کتاب میں یہ خبر دیتے ہوئے کہ

"اسی عرصہ میں غدر ہو گیا۔" ص ۳۶

آگے وہی سیدنا الامام الکبیر کے متعلق یہ اطلاع دیتے ہیں۔

"بعد رمضان احقر کو سہارن پور لینے کو تشریف لائے، چند آدمی اور وطن دار ساتھ تھے، اس وقت راہ چلنا بدون ہتھیار اور سامان کے دشوار تھا۔" ص ۳۶

جس سے حسب ذیل نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) غدر کے زمانہ میں ہمارے مصنف امام اپنے وطن نانوتہ میں نہیں بلکہ سہارنپور میں تھے۔

(۲) لیکن سیدنا الامام الکبیر (بجائے دلی یا میرٹھ کے) معلوم ہوتا ہے کہ نانوتہ ہی میں قیام فرما تھے۔

(۳) یہ رمضان جس کا مصنف امام نے اس موقعہ پر ذکر کیا ہے، یقیناً رمضان کا وہی مہینہ ہے، جس میں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں میرٹھ کی فوج باغی ہوئی، اور باغی ہو کر دلی پہنچی۔ قدرتی طور پر دلی سے جو علاقے زیادہ متصل تھے جیسے مظفر نگر، سہارنپور وغیرہ معلوم ہوتا ہے کہ بے آئینی کے عام آثار سے رمضان ہی میں متاثر ہو چکے تھے۔ راستہ کا امن وامان ختم ہو چکا تھا۔ اب خواہ عوام نے خود قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا، یہ اس کا نتیجہ ہو، یا جیسا کہ مولوی عاشق الٰہی صاحب کا بیان ہے کہ

"گورنمنٹ نے باغیوں کی بغاوت کے باعث اپنا امن اٹھا لیا۔ اور بذریعہ اشتہار عام اطلاع دے دی کہ اپنی حفاظت ہر شخص کو خود کرنی چاہئے۔" ص ۷۴، تذکرۃ الرشید ج ۱

[1] جیسا کہ جنتری صد سالہ مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ مرتبہ مولانا ابوالحسنات قطب الدین احمد صاحب لکھنوی سے واضح ہے ۱۲

اس کی وجہ سے یہ صورت حال پیدا ہوگئی ہو۔

(۴) سیدنا الامام الکبیر کی جلادت اور پُردلی (بہادری) کی شہادت کے ساتھ ساتھ مصنف امام کے مذکورہ بالا بیان کا کھلا ہوا اقتضاء یہ ہے کہ غدر کے شروع ہونے کے ساتھ ہی سیدنا الامام الکبیر قطعاً اس ہنگامہ میں شریک نہ ہوئے۔ بلکہ نانوتہ سے سہارنپور آنے کے بعد بجائے اس کے کہ جن میدانوں میں مقابلہ ہو رہا تھا، ان میں سے کسی میدان کی طرف چلے جاتے، اپنے ساتھ مصنف امام کو لے کر وطن نانوتہ ہی تشریف لے آئے۔

یہ بدیہی نتائج ہیں جو مصنف امام کی مذکورہ بالا اطلاع سے پیدا ہوتے ہیں۔ آگے یہ سوال کہ نانوتہ میں آپ کا کب تک قیام ایام غدر میں رہا؟ قطعی طور پر تو اس کا جواب دینا مشکل ہے لیکن مصنف امام اسی سلسلہ میں جب سہارنپور سے سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ نانوتہ پہنچے، اور ان دونوں بزرگوں کا قیام اسی قصبہ میں تھا۔ آگے جو یہ لکھا ہے کہ

"جب احقر وطن (نانوتہ) پہنچا، چند ہنگامے مفسدین کے پیش آئے جس میں مولانا کی کمال جرأت و ہمت ظاہر ہوئی"۔ ص۳۶

بظاہر اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ خود نانوتہ پر بھی لوٹ مار کرنے والے غارتگروں نے حملہ کیا، اور قصبہ والوں کے ساتھ مل کر ان کی مدافعت میں سیدنا الامام الکبیر نے بھی امتیازی حصہ لیا۔ ایک نہیں بلکہ "چند ہنگامہ کے پیش آئے" کے لئے چاہئے تو یہی کہ "کافی عرصہ" تک مانا جائے کہ نانوتہ میں سیدنا الامام الکبیر کا قیام رہا، افسوس ہے کہ ان ہنگاموں کی تفصیلات کے جاننے کی کوئی صورت باقی نہ رہی، یہ کون لوگ تھے، اور نانوتہ پر بار بار حملہ کیوں کرتے تھے، ان سوالوں کا کیا جواب دیا جائے۔

شاید ان ہی ہنگاموں کی وجہ سے بھی، اور جیسا کہ مولٰنا عاشق الٰہی کا بیان ہے کہ حفاظت کی ذمہ داری حکومت نے اپنے سر سے اتار کر خود ہندوستان کے باشندوں کے سر ڈال دی تھی کچھ اس وجہ سے بھی، یا یہ کہ مستقبل میں کیا صورتیں پیش آنے والی ہیں۔ کچھ اس کے امکانات کو بھی

سوچ کر مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"اس زمانہ میں (یعنی جب ملک میں غدر برپا تھا اور ان کا قیام نانوتہ میں تھا) ہمارے بھائی ہم عمر، اکثر بندوق اور گولی لگانے میں مشق کرتے رہتے تھے۔"

جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ نانوتہ میں شیوخ کی جو عام برادری تھی، اس میں نشانہ بازی وغیرہ جیسے جنگی مشاغل کی مشق کا غیر معمولی ذوق اور شوق پیدا ہو گیا تھا۔ کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ شاید آئندہ شریک ہونے اور شریک کرانے کی یہ تمہید ہو۔ لیکن اب اسے کیا کیجئے۔ مصنف امام ہی نے اسی کے بعد جو کچھ لکھا ہے، اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے، کہ ان جنگی مشقوں سے کم از کم ذاتی طور پر سیدنا الامام الکبیر کا نہ کوئی تعلق تھا، اور نہ کسی خاص قسم کی دل چسپی ہی معلوم ہوتی ہے، کہ ان مشاغل سے آپ لیتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جس زمانہ میں نانوتہ کے نوجوان چاندماری کی مشق کر رہے تھے، کہ

"ایک دن آپ (سیدنا الامام الکبیر) مسجد سے آئے، ہم گولیاں لگا رہے تھے، اور نشانہ کی جائے پر ایک نیم کا پتہ رکھا تھا، اور اس کے گرد ایک دائرہ کھنچا تھا، قریب سے بندوق لگاتے تھے۔ گولیاں مٹی کی تھیں۔"

جس سے پتہ چلتا ہے کہ چاندماری میں مٹی کی گولیوں کے استعمال کرنے کا طریقہ ہندوستان میں مروج تھا۔ یا قلت سرمایہ کا یہ نتیجہ ہو، بہرحال وہی کہتے ہیں کہ مسجد سے نشانہ بازی کے اسی مقام پر پہنچ کر

"مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) نے فرمایا کہ بندوق کیونکر لگاتے ہیں، مجھے بھی دکھلاؤ۔" ص۱۱

اس کے سوا اور مطلب اس کا کیا سمجھا جائے کہ غدر کے ہنگاموں میں کافی زور جس زمانہ میں پیدا ہو چکا تھا، اس وقت تک سیدنا الامام الکبیر بندوق چلانا بھی نہیں جانتے تھے۔ بندوق کیونکر لگاتے ہیں؟ پہلی دفعہ اپنی پوری زندگی میں بندوق چلانے والوں سے یہ پہلا سوال آپ کی طرف سے شاید

پیش ہوا۔ اب یہ آپ کی عبقریت اور فطرت فائقہ کا نتیجہ تھا جیسا کہ مصنف امام لکھتے ہیں کہ

دریافت فرمانے پر

"کسی نے ایک فیر کی اور قاعدہ نشانہ کا ذکر کیا"۔ ص۳۶

گویا کر کے بھی دکھایا، اور نشانہ پر گولی مارنے کا جو طریقہ ہے، اسے بھی زبانی بتا دیا۔ مصنف امام کا بیان ہے کہ بس ایک دفعہ دیکھ اور سن لینے کے بعد دیکھا گیا کہ سیدنا الامام الکبیر نے،

"تب بندوق ہاتھ میں لے کر فیر کی"۔ ص۳۶

لوگ نشانہ کی طرف دوڑے وہی لکھتے ہیں کہ دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ

"صاف گولی نشانہ پر لگی"۔ ص۳۶

اس کے بعد مصنف امام نے اس قسم کی باتوں کا ذکر کر کے کہ نانوتہ کے دوسرے نوجوان جو زمانہ سے نشانہ بازی کی مشق کر رہے تھے اور نیم کے پتہ کی جگہ اس دائرے میں گولی کو پہنچا دینے کو کامیابی سمجھتے تھے جو پتہ کے اردگرد کھینچ دیا جاتا تھا، ان کے مقابلہ میں بغیر کسی سابقہ مشق کے محض ایک دفعہ دیکھ لینے اور سن لینے کے بعد پہلے فیر ہی میں ٹھیک نشانہ یعنی نیم کے پتہ کو اپنی گولی سے سیدنا الامام الکبیر نے جو اڑا دیا تھا، ممکن ہے کہ اس کو "بر ہدف زند تیرے" کا اتفاقی واقعہ سمجھا جائے۔ مگر اپنے ذاتی تجربات کی بنیاد پر اس خیال کی تردید کرتے ہوئے وہی لکھتے ہیں کہ

"یہ بات اتفاقی نہ تھی، اپنی فہم سے حقیقت نشانہ بازی کی سمجھ کر بدن ایسی وضع پر سادہ لیا جو فرق ہو جانے کی وجہ نہ ہوئی۔ تیر اندازوں کو دیکھا ہے کہ سر سے پا تک ایک خط مستقیم ہو جاتے ہیں"۔ ص۳۷

اور جو بھی سیدنا الامام الکبیر کی فطرت فائقہ کی خصوصیتوں سے تھوڑا بہت واقف ہے۔ وہ مصنف امام کی رائے کی تائید ہی کرے گا۔ مگر مجھے اس موقعہ پر مصنف امام کے بیان کی روشنی میں یہ کہنا ہے کہ مقابلہ اور مقاتلہ میں عملی شرکت کا فیصلہ سیدنا الامام الکبیر اگر پہلے سے کئے ہوئے ہوتے، تو اس زمانہ تک آپ کا جنگی آلات کم از کم بندوق کے استعمال سے اس درجہ بیگانہ رہ جانا کیا ممکن تھا،

کچھ بھی ہو، اتنی بات بہر حال یقینی ہے اور ان ناقابل انکار چشم دید گواہیوں کا کھلا ہوا اقتضاء ہے، کہ مالی خولیا سے زیادہ اس قسم کی افواہوں کی کوئی قیمت نہیں ہے کہ غدر کے ہنگامہ کے برپا کرانے میں دوسروں کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر اور آپ کے علمی و دینی رفقاء کے بھی ہاتھ تھے۔ بلکہ واقعہ وہی ہے جو مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"مولانا فسادوں سے کوسوں دور تھے"

آخر حسب روایت مولانا طیب صاحب جب سنبھالنے والے حضرت والا کو نظر نہیں آ رہے تھے تو تعمیر سے پہلے تخریب کی یا خروج سے پہلے نزول کا خیال ممکن ہے عامیوں کے نزدیک ضروری نہ ہو، لیکن سیدنا الامام الکبیر جیسے دین کی مثالی شخصیتوں کے متعلق اس قسم کے خود تراشیدہ اوہام بد اندیشوں کے سوا اور بھی کچھ ہو سکتے ہیں؟۔

سیاست جن لوگوں کے نزدیک صرف مار دھاڑ، اکھاڑ پچھاڑ کا نام ہے، وہ تو جو چاہے سوچیں، سوچ سکتے ہیں جو چاہے کر سکتے ہیں۔ لیکن اسلام اپنے ماننے والوں کو جس قلب سلیم، ذہن سلیم، دماغ سلیم، فکر سلیم کا مالک بنا دیتا ہے، ان لوگوں سے غوغائیوں اور جوشیوں کی بہنگم حرکات کی توقع دلیل ہے اس بات کی کہ توقع کرنے والے اسلام کی روح سے قطعاً بے گانہ ہیں، ایک صحیح اسلامی وجود، امن کی حالت میں ہو یا جنگ کی حالت میں، کسی وقت اور کسی حال میں کسی کے لئے نہ وہ دھوکا ہے اور نہ فریب، ہر حال میں آئین اور اصول کی پابندی بھی مسلمان کی زندگی کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو ہے۔ اسی لئے اپنے ماحول میں رہنے والوں کے لئے امن و عافیت، طمانیت و سکینت، سلامتی اور خوش باشی کی وہ مجسم ضمانت ہوتا ہے۔ دوست تو دوست دشمن بھی اسی بھروسہ کو اپنے دل میں پاتے ہیں اور یہی ان کو پانا بھی چاہئے کہ غیر آئینی طریقے اختیار کر کے مسلمان کسی کے لئے کسی زمانہ میں کسی جگہ خطرہ نہیں بن سکتا۔ اس امتیازی خصوصیت سے جو جتنا زیادہ دور ہے، سمجھنا چاہئے کہ اسی حد تک وہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کی روح سے دور ہے۔

۲

بہر حال فسادوں سے قطعی دور ہونے کے باوجود پھر یہ سوال کہ آخر اس واقعہ کی صحیح نوعیت کیا تھی جس کی وجہ سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء والے ہنگامہ میں سیدنا الامام الکبیر نے بھی عملی حصہ لیا تھا۔ جیسا کہ مسلسل کہتا چلا آرہا ہوں، اصل واقعہ کا انکار تو واقعہ کا انکار ہوگا، ایسے سارے ذرائع جن سے غیر مشتبہ یقین کے سوا اور کچھ پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ واقعہ پہلی نسلوں سے آئندہ نسلوں تک منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ قطعی طور پر ثابت ہے، کہ آپ لڑے بھی، زخمی بھی ہوئے الغرض سوانح مخطوطہ کے مصنف کے لفظ "غازی" کے لئے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے، ان سب کے حاصل کرنے کے مواقع قدرت کی طرف سے آپ کے لئے آسان کئے گئے تھے۔

ایک چیز یعنی تاریخ وار تو ساری کڑیوں کا مرتب کر کے پیش کرنا مشکل کیا میرے لئے تو ناممکن ہے۔ جن وثائق اور کتابوں سے معلومات کی فراہمی میں مدد ملی ہے سب کے سب تاریخ کے ذکر سے خالی ہیں۔ واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن کب کس مہینہ میں مہینہ کی کس تاریخ میں یہ واقعہ پیش آیا، اس کا ذکر کسی نے نہیں کیا ہے۔ تاہم ان ہی بزرگوں کا صدقہ ہے کہ تاریخ کی تعیین کے بغیر ہی سہی لیکن واقعات تو بحمد اللہ معلوم ہو گئے۔

غدر کا ہنگامہ ملک کے طول وعرض میں برپا تھا۔ اور جیسا کہ آپ دیکھ چکے کافی عرصہ تک اس زمانہ میں ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر اپنے آبائی وطن نانوتہ ہی میں مقیم رہے۔ نانوتہ کے قیام کے ان دنوں میں بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ قصبہ پر شورش پسند غوغائیوں کی طرف سے متعدد بار حملے ہوئے، باشندگان قصبہ کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر بھی مدافعت میں حصہ لیتے رہے۔ بقول مصنف امام

"جس میں مولانا کی کمال جرأت وہمت ظاہر ہوئی"۔

مدافعت کی ان کارروائیوں کو بھی غدری ہنگامہ کی شرکت قرار دی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس حد تک قیام نانوتہ ہی کے زمانہ میں گویا آپ شریک ہو چکے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ

شرکت آپ کی تو فرمان نبوی

من قتل دون ماله فهو شهيد ومن قتل دون عرضه فهو شهيد الحديث	جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتا ہوا مارا گیا وہ شہید ہے اور جو اپنی آبرو بچاتے ہوئے مارا گیا وہ شہید ہے الخ

کی تعمیلی شکل تھی

سوال یہ ہے کہ ہندوستان کی مقامی حکومت کو ختم کر کے باہر کی جس قوم نے اس ملک پر سیاسی اقتدار اپنا قائم کر لیا تھا۔ باہر سے مسلط ہونیوالے اس بیرونی اقتدار کے ساتھ تصادم اور مقابلہ کی صورت کہاں اور کیوں پیش آئی کیونکہ مقصود اس سلسلہ میں مقابلہ اور مقاتلہ کا یہی پہلو ہے۔ اس پر غور کرنے کے لئے اس مقدس جماعت کی تاریخ اعلاء کلمۃ اللہ کو سامنے رکھ لینا چاہئے۔ یہ تو ہندوستان سے مسلمانوں کا اقتدار ختم ہو کر ایک بدیسی کے اقتدار کے سامنے آجانے کا سلسلہ تھا۔ ان حضرات کے سید الطائفہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے تو خود مسلم اقتدار میں بھی ہر مذہبی اور سیاسی باطل کے خلاف علم جہاد بلند رکھا۔ تو ان کے تربیت یافتہ کفر کی شوکت کے زمانہ میں اعلاء کلمۃ الحق کے مقصد سے کیسے دست بردار ہو سکتے تھے اس لئے ان حضرات کے سامنے سب سے پہلے تو یہ اعلاء کلمۃ الحق کا مقصد سامنے تھا۔ ساتھ ہی قومی طور پر ہندوستان کی بسنے والی اقوام میں کوئی قوم ایسی نہ تھی جو انگریزوں کے ابتدائی طرز عمل اور مظالم سے تنگ آئی ہوئی نہ ہو، جس میں مسلمان خصوصیت سے زیادہ متاثر تھے۔ اس لئے ان بزرگوں کے سامنے اعلاء کلمۃ اللہ کے ساتھ ساتھ عام ہندوستانی اقوام کی بہبودی اور فلاح کا مسئلہ بھی پیش نظر تھا۔ جس کا حل اس کے سوا دوسرا نہ تھا کہ انگریزوں کا اقتدار اس ملک میں باقی نہ رہے۔

ساتھ ہی سیدنا الامام الکبیر کے ان اکابر حضرت سید احمد شہید اور حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمہما اللہ کا قریبی اسوہ بھی پیش نظر تھا۔ ان چند در چند وجوہات کے تحت ان اکابر میں یہ جذبہ بطور قدر مشترک کے موجزن تھا کہ اس ملک کی بہبود و فلاح انگریزوں کے قیام اور راج میں نہیں ہے بلکہ ان کے یہاں سے ہٹنے اور باہر ہو جانے میں ہے۔ البتہ اس جذبہ کے ساتھ جس طاقت کی

ضرورت تھی، وہ مسلمانوں میں باقی نہ تھی اگر وہ ہوتی تو ملک ہی ہاتھ سے کیوں جاتا۔ اس لئے رات دن ان بزرگوں میں اس کا ذکر و فکر رہتا تھا کہ یہ بھاری پتھر اس ملک کے سر سے کیسے اٹھایا جائے۔

اسی دوران میں ۵۷ء کا ہنگامہ پیش آیا۔ جب تک اس ہنگامہ کی صورت ایک غدر اور بلوہ کی رہی۔ ان بزرگوں کو اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن جب کہ اس نے طول کھینچکر ملک کی رعایا کو راعی کے مقابلہ پر لا کھڑا کیا اور اب سوال ہندوستانی اور انگریز کا پیدا ہو گیا۔ جس میں اس کے امکانات نظر آنے لگے کہ انگریز کا پنجۂ استبداد ڈھیلا پڑ جائے یا اس کے پیر ہی اکھڑ جائیں تو یقیناً اس موقعہ سے فائدہ اٹھانا ان بزرگوں کے اصلی اور بنیادی نصب العین میں معاون ہو سکتا تھا اس لئے خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ بالخصوص جبکہ انگریزوں کے مظالم جو اس سلسلہ کے محرک تھے آخر کار اپنی انتہا کو پہنچ گئے تھے تو اب کون سی چیز رہ گئی تھی جو ان بزرگوں کے ارادوں میں حرکت پیدا نہ کرتی اور سیدنا الامام الکبیر کو جو اس سلسلہ کو بہت پہلے سے بچشم بصیرت و عبرت دیکھ رہے تھے اس میدان میں آنے سے روکتی۔

بہر حال جذبۂ اعلاء کلمۃ اللہ، مذہبی حمیت ملکی غیرت اور برادران ملک کی مظلومیت عامہ کے پیش نظر ان کے استخلاص کا جذبہ وغیرہ اصل بواعث تھے جنہوں نے ان بزرگوں کو خاک و خون کے تماشوں میں لا کھڑا کیا۔

اس سلسلہ میں انگریزی مظالم کے بعض ناگفتہ حوادث بھی ایسے پیش آئے جس سے ان بزرگوں کے عزائم میں جلد حرکت ہو گئی اور خود ان حوادث میں بھی بعض شرعی پہلو ایسے تھے کہ ان کی بناء پر ان کے عزائم کو جلد متحرک ہو جانا چاہئے تھا جس میں سے مثلاً ایک یہ بھی ہے جس سے انگریزوں کی معاہدہ شکنی اور غداری کھلے طور پر واضح ہوتی ہے کہ

سب سے پہلے اس باب میں ایک اطلاع مولانا عاشق الٰہی مرحوم کی کتاب تذکرۃ الرشید میں ملتی ہے۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ تھانہ بھون جو سیدنا الامام الکبیر کے پیر و مرشد

حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا وطن پاک تھا۔ اسی تھانہ بھون کے قصبہ میں قاضیوں کا ایک اچھا خاصہ خوش حال رئیس خاندان بھی رہتا تھا۔ قاضیوں کے اس خاندان کے ٹوٹے پھوٹے مکانات خستہ اور بوسیدہ حال میں اب بھی تھانہ بھون میں موجود ہیں۔ سرسری نظر اس پر خاکسار کی بھی پڑچکی ہے۔ مکانات کیا محل سراؤں کی شان ان سے اب بھی نمایاں ہے۔ بظاہر کافی آمدنی والی جاگیر حکومت مغلیہ سے قاضیوں کے اس خاندان کو ملی ہوئی تھی۔ جب زمانہ میں غدر کا فتنہ ملک میں شروع ہوا، قاضیوں کے اس خاندان کے رئیس قاضی عنایت علی خاں نامی تھے۔ مولنا عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ وہ

"تھانہ بھون کے نیک دل سرکاری خیر خواہ زمیندار" تذکرۃ الرشید ج۱ ص۷۴

تھے۔

بظاہر اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے، کہ عام بغاوت کے پھوٹ پڑنے کے بعد بھی سرکار یعنی حکومت مسلطہ کے ساتھ بہی خواہی اور مصالحت پسندی کا رشتہ جن لوگوں نے قائم کر رکھا تھا، ان میں تھانہ بھون کے قاضیوں کا یہ زمیندار رئیس خاندان بھی تھا۔ نیز تھانہ بھون کی شورش کے آغاز کے متعلق تذکرۃ الرشید ہی کے حاشیہ پر جو فقرہ درج کیا گیا ہے کہ

"اسی گھٹاٹوپ اندھیاؤ میں جب کہ کئی جگہ غدر پڑچکا تھا۔ اور دہلی اس کا آشیانہ تھا۔" ص۷۳

اس میں تو اس کی تصریح بھی کردی گئی ہے، کہ عام بغاوت کی آگ ملک میں پھیل چکی تھی، اور میرٹھ وغیرہ چھاونیوں سے منتقل ہو کر دلی کو اپنی جد وجہد اور کشمکش کا مرکز جب لوگ بنا چکے تھے، تب کچھ دن بعد خلفشار کی ابتدا تھانہ بھون میں ہوئی۔

اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ اور کہیں جو کچھ بھی ہو رہا ہو، لیکن جس قصبہ میں بتایا جاتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے عملی حصہ لیا تھا، ظہور غدر کے کافی عرصہ کے بعد اس قصبہ کی ابتدا ہوئی۔ بہرحال مولنا عاشق الٰہی مرحوم کی روداد کے مطابق ہوا یہ کہ تھانہ بھون کے ان ہی قاضی عنایت علی کے ایک چھوٹے بھائی بھی تھے، جن کا نام عبد الرحیم تھا۔ لکھا ہے کہ ریاست کے

بست دکشاد نظم و انتظام کا تعلق تو قاضی عنایت علی بڑے بھائی کے سپرد تھا، اور قاضی عبدالرحیم چھوٹے بھائی، جن کو قاضی صاحب گویا بیٹے کی طرح مانتے تھے۔ صرف امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، اب سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے زمانہ میں جب ملک میں عام بدامنی پھیلی ہوئی تھی، بقول مولوی عاشق الٰہی صاحب مرحوم

"باہم رعایا میں برسوں کی دبی ہوئی عداوت نکلنے اور خدا جانے کس کس زمانہ کے انتقام لینے کا وقت آگیا، جدھر دیکھو مار پیٹ، اور جس محل پر نظر کرو معرکہ آرائی و جنگ" صـ۳۷

اس علاقہ روہیلکھنڈ میں جب سر سید احمد خاں کے ساتھ یہ صورت پیش آئی کہ بجنور جہاں وہ حکومت کے ایک ذمہ دار افسر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ اسی بجنور سے میرٹھ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ لیکن باہر قدم نکالنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی بہ مشکل بجنور سے ہَلدَور نامی مقام تک ڈپٹی رحمت خاں کی معیت میں پہنچ پائے۔ رات کو ہلدور سے پیادہ پا میرٹھ کے ارادہ سے نکلے کہ موضع پلانہ کی سرحد پر بقول مولنا حالی

"دو ہزار گنوار مسلح ان کے لوٹنے اور مار ڈالنے کے ارادہ سے دوڑے"

سید صاحب کی زندگی باقی تھی، بخشی نامی ایک پدھان نے جاں بخشی کرائی، پلانہ سے گرتے پڑتے چاندپور پہنچے، چاندپور میں بھی

"کئی ہزار آدمیوں نے بندوقوں اور ہتھیاروں سے ان کو گھیر لیا"

یہاں بھی چاندپور کے رئیس میر صادق علی خاں فرشتہ رحمت بن کر آڑے آگئے اور سید صاحب کی جان بچ گئی۔ چاندپور، بچھراؤں ہوتے ہوئے بہ ہزار خرابی افتاں و خیزاں جس وقت میرٹھ تک پہنچنے میں سید صاحب کامیاب ہوئے تو مولوی حالی صاحب نے لکھا ہے کہ

"ان کے (سید صاحب) کے پاس چھ پیسے اور اس پھٹے ہوئے کرتے کے سوا جو وہ پہنے ہوئے تھے اور کچھ نہ تھا" صـ۶۸ حیات جاوید

الغرض حالات تو ایسے گندے تھے۔ لیکن قاضی عبدالرحیم قاضی عنایت علی خاں کے چھوٹے بھائی کو خدا ہی جانتا ہے ہاتھیوں کے خریدنے کا سودا دماغ میں کیوں سمایا؟ سہارنپور ہی اس علاقہ کا مرکزی شہر تھا، وہیں اس شوق کی تکمیل کا امکان تھا، مولنا عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ ہاتھیوں کی خریداری کے شوق میں تھانہ بھون سے

"مع چند احباب کے سہارنپور گئے۔ اور سرائے میں کسی دوست کے پاس ٹھہرے"

یہاں تک تو واقعہ عام رنگ میں رہا۔ اب آگے تقدیر تدبیر کے جس پیچیدہ رنگ میں پیش ہوئی اور شرارہ کوہ آتش فشاں بن گیا، اس کی تفصیل سنئے، بظاہر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سہارنپور کا یا تو غدر کے قصوں میں کوئی حصہ ہی نہ تھا یا کچھ تھا بھی تو بات دب دبا چکی تھی، سنکھی صاحب نامی کوئی انگریز افسر بقول مولنا عاشق الٰہی

"باغیوں کی سرکوبی کے لئے حکم موت کا مجاز بنا کر انتظاماً ضلع سہارنپور میں معین کیا گیا تھا۔" ص ۳۰

اتفاق کی بات کہ ایک بنیا جس کا نام تو معلوم نہ ہو سکا، لیکن مولوی عاشق الٰہی صاحب کے ان الفاظ سے کہ سہارنپور میں وہی بنیا

"کئی دن سے ٹھہرا ہوا تھا۔"

قیاس یہی چاہتا ہے کہ سہارنپور کا باشندہ نہ تھا، اب خواہ تھانہ بھون کا ہو، یا تھانہ بھون کے قریب کسی جگہ کا، تھانہ بھون کے قاضیوں کے اس خاندان سے وہ صرف واقف ہی نہ تھا بلکہ کسی وجہ سے وہ ان لوگوں سے کھنچا ہوا تھا، مولوی عاشق الٰہی نے جو یہ لکھا ہے کہ

"زمیندارانہ قصوں میں آدمی کے دشمن بہتیرے ہو جاتے ہیں۔"

اسی نوعیت کے کسی قصہ میں وہ قاضیوں کے اس خاندان کا دشمن بن گیا تھا۔ ایسے فتنہ اور فساد کے زمانہ میں تھانہ چھوڑ کر قاضی عبدالرحیم کا سہارنپور آنا اور یہ شہرت کہ ہاتھی خریدنے کے لئے آئے ہیں بات ہی ایسی تھی کہ انتقام کا مغتنم موقعہ بنئے کو محسوس ہوا کہ سامنے آگیا ہے۔ سیدھے سنکھی صاحب کی

مولانا عاشق الٰہی کے حاشیہ والے بیان میں ہے کہ بعد کو حکومت نے بنکھی کے فیصلہ کو غلط ٹھہراتے ہوئے اقرار بھی کیا تھا کہ

"غلطی سے یہ حرکت سرزد ہو گئی" صلا

جانتے ہیں حکومت کی یہ اعترافی غلطی جس کا مرتکب حکومت کا نمائندہ بنکھی صاحب ہوا، کیا تھی؟ بعد بے کسی و بے بسی ایک آدمی نہیں بلکہ قاضی عبدالرحیم اور ان کے رفقا جو تھانہ سے ان کے ساتھ آئے تھے، مولوی عاشق الٰہی کی اطلاع ہے کہ اس

"ناکردہ گناہ جماعت کو پھانسی کا حکم ہو گیا"

ایک ایسا مجہول الحال بنیا جس کا نام آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ کیا تھا، کہاں کا تھا، کس رتبہ کا آدمی تھا اس کی خبر اور بازاری افواہ کی بنیاد پر یہی سوچنے کی بات ہے کہ کسی فرد کو نہیں، بلکہ ایک پوری امن پسند آئینی زندگی بسر کرنے والی جماعت کو صرف قید و بندی کی سزا نہیں بلکہ سب کو کسی تحقیق و تلاش کے بغیر پھانسی پر چڑھا دینا اور اس کا کچھ خیال نہ کرنا کہ جن لوگوں کو پھانسی دی جا رہی ہے ان میں علاقہ کا ایک صاحب اقتدار رئیس بھی ہے، بنکھی صاحب کا یہ مجرمانہ اقدام، اور قطعاً ظالمانہ فیصلہ قطع نظر اس سے کہ کتنا غیر مآل اندیشانہ تھا، سوچنے کی بات یہ ہے، کہ حکومت کے آئین اور دستور کی بے حرمتی اور رسوائی کی اس سے زیادہ بدترین شکل اور کیا ہو سکتی تھی، غدر کا لفظ جس کا انتساب اور اطلاق اس زمانہ کے ہندوستانیوں کے طرز عمل پر کیا جاتا ہے۔ خدا جانے بولنے والوں کی غرض کیا ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ وہی قانونی اصطلاح ہے، جو ہماری فقہ کی کتابوں میں مستعمل ہے تو مطلب اس کا جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں یہی ہو سکتا ہے کہ اس ملک کے باشندوں نے حکومت وقت سے یہ معاہدہ جو کیا تھا کہ اس کے نافذ کردہ آئین و دستور کی پابندی کریں گے، اس معاہدہ کو توڑ کر غدر یعنی قانون شکنی کے لوگ مرتکب ہوئے تھے۔

اگر غدر کا یہی مطلب ہے، تو میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں، کہ ادھر کہیں جو کچھ بھی ہوا[۱] ہو، لیکن

---

[۱] پچھلے چند دنوں سے جیسا کہ شاید ذکر کر چکا ہوں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کا ذکر ہندوستانیوں کی پہلی (باقی اگلے صفحہ پر)

ضلع سہارنپور میں غدر کے اس جرم کا مجرم انصاف سے بتایا جائے صحیح معنوں میں کون تھا، حکومت کے آئین کو کس نے توڑا۔ یقیناً پنکھی صاحب اس الزام کے ملزم ہیں، اور ان کی وجہ سے ہم غدر کے اس الزام کو اس حکومت پر بھی عائد کر سکتے ہیں۔ جس کی نمائندگی سہارنپور میں پنکھی صاحب کرتے تھے۔

آئندہ حوادث وواقعات کے جلد جلد رونما ہونے میں بظاہر پنکھی صاحب اور پنکھی کی آمریت اور اس کی غدارانہ اور ظالمانہ چیرہ دستیوں کو بھی دخل تھا۔ اور قرآن کی سورۂ شوریٰ میں اہل ایمان کے امتیازی اوصاف کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہوئے یعنی

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ	اور وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب کا کہنا مانا اور نماز قائم کی اور ان کا کام باہمی مشورہ سے تھا اور جو ہمارے دیئے ہوئے میں سے خرچ کرتے تھے۔

آخر میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ (پارہ ۲۵ سورہ شوریٰ رکوع ۴)	اور جو ایسے ہیں کہ جب ان پر ظلم واقع ہوتا ہے تو وہ برابر کا بدلہ لیتے ہیں۔

(گذشتہ صفحہ سے) جنگ آزادی وغیرہ کے عنوانوں سے لوگ کرنے لگے ہیں۔ غدر کے لفظ کا اطلاق اس واقعہ پر ان کے نزدیک درست نہیں ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ غدر کے لفظ کو باقی بھی رکھا جائے۔ جب بھی سوال یہ رہ جاتا ہے کہ غدر یعنی آئین شکنی کی ابتدا کس کی طرف سے ہوئی۔ باشندگان ہند کی طرف سے یا حکومت کی طرف سے؟ میرے لئے تفصیل کا یہ موقع نہیں لیکن اتنا تو یہ صحیح ہے کہ کارتوسوں میں چربی لگانے اور دانت سے ان کو کٹوانے کا حکم حکومت کی طرف سے دیا گیا، اور غلط ہو یا صحیح لیکن جن کو حکم دیا گیا تھا ان کے نزدیک یہ ان کے دین اور دھرم میں صراحۃً دخل اندازی تھی۔ احتجاج ان کا قانونی حق تھا۔ جس پر بیرو دستور اور اس کے تقاضا برخلاف گورنر جنرل نے احتجاج کرنے والے سپاہیوں میں سے بعضوں کو پھانسی اور بعضوں کو عبور دریائے شور کی سزائے دی۔ بارک پور میں بھی یہی صورت پیش آئی۔ میرٹھ میں بھی جو کچھ کیا گیا مارشل لا کے اعتبار سے بھی وہ درست نہ تھا۔ اسی طرح سہارنپور میں قاضی عبدالرحیم اور ان کے رفقاء کا افواہ پر قتل ہی قطعاً قانون شکنی اور غدر تھا۔ پس اگر غور کیا جائے تو غدر کی صورت ضرور پیش آئی لیکن ہندوستان کے باشندوں کے بجائے غدر یعنی معاہدہ کی خلاف ورزی اور آئین شکنی کی ابتدا، جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے حکومت ہی کی طرف سے ہوئی۔ پس غدر کا کیوں انکار کیا جائے۔ انکار اس کا کرنا چاہئے کہ ہم ہندوستانیوں نے غدر نہیں کیا تھا۔ اس جرم کی مجرم خود حکومت تھی۔

سیاسی یادداشت میں "تھانہ بھون" کی جس مجلس شوریٰ کا تذکرہ کیا ہے۔ ابھی اس کا حال بیان کیا جائے گا۔ ہم اس مجلس میں سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا گنگوہی کو بھی پاتے ہیں۔ اسی سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ انتقام کا ارادہ جب پختہ ہو گیا تو گنگوہ تک لوگ بھیجے گئے، اور جن جن سے انتصار کی اس مہم میں صحیح راہ نمائی کی توقع ہو سکتی تھی ان کو تھانہ طلب کیا گیا۔ ان دونوں بزرگوں کے مرشد برحق حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا تو تھانہ وطن اور مستقر ہی تھا، ان کے سوا حضرت حافظ محمد ضامن شہید اور مولانا شیخ محمد تھانوی بھی تھانہ ہی میں موجود تھے۔

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاضی عبدالرحیم کے پھانسی پانے کے بعد تھانہ بھون کے رد عمل پر چونکہ حکومت کی نظر بھی تھی، احتیاط کا تقاضا بھی یہی تھا، اس لئے قاضی صاحب کی طرف سے جو انتصاری کئے یا انتقامی کارروائیاں ہو رہی تھیں، ان کی خبریں گوئندوں کے ذریعہ حکومت تک پہنچتی رہتی تھیں۔ شاید اسی زمانہ کی یہ بات ہے جس کا ذکر مولانا عاشق الٰہی نے تذکرۃ الرشید کے حاشیہ پر کیا ہے، کہ قاضی عنایت علی کے پاس

"کمپنی کی طرف سے پیام پہنچایا گیا کہ تم فساد سے باز آجاؤ، اپنے بھائی کو صبر کرو، غلطی سے یہ حرکت سرزد ہو گئی ہے، اگر تم انتقام سے باز آگئے، تو تم کو تھانہ کا نواب بنا دیا جائے گا۔" صے

مگر پیام کارگر ثابت نہ ہوا، جو بلائے گئے تھے۔ تھانہ بھون میں جمع ہو گئے۔

یہ بالکل ممکن تھا، کہ جمع ہونے کے بعد قاضی عنایت علی صاحب کی منشار کے مطابق جیسے ہر جگہ مار دھاڑ اکھاڑ پچھاڑ کی اندھا دھند کارروائیاں ہو رہی تھیں۔ تھانہ بھون میں اسی کو شروع کر دیا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا، بلکہ قرآن کی مندرجہ بالا آیت میں جہاں بغی کے بعد انتصار کو ایمانی زندگی کا امتیازی وصف قرار دیا گیا ہے۔ وہیں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ

وامرھم شوریٰ بینھم	اور ان (مسلمانوں) کے معاملات باہمی مشورہ سے ہوتے ہیں۔

ایمانیوں کی شان ہے۔ مولانا طیب صاحب کی سیاسی یادداشت میں ہے کہ تھانہ میں مجلس شوریٰ

قائم ہوئی،

"جس میں حضرت گنگوہی، اور دوسرے علماء شریک تھے"

یہ بھی ان ہی کا بیان ہے کہ اس مجلس میں

"باہم علمی گفتگو چھڑی"

سوال یہی تھا کہ واقعات جس رنگ میں پیش آچکے تھے، یعنی اپنے قانون کو توڑ کر حکومت اور حکومت کا نمائندہ غدر اور قانون شکنی کا مرتکب ہو چکا تھا۔ اس بغی کے مقابلہ میں انتصار کے فرض کو محسوس کرتے ہوئے، جہاد وقتال پر آمادہ ہونے کا وقت کیا آگیا ہے؟ مولنا طیب صاحب نے لکھا ہے، کہ

"اس موقعہ پر جہاد کے سب خلاف تھے، صرف حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مدعیانہ طریقہ پر اس میں پیش پیش تھے"

تذکرۃ الرشید کے حاشیہ پر مولانا عاشق الہٰی نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

"سنا یہ گیا ہے کہ قاضی عنایت علی کو ہمارے اکثر دینی حضرات نے اس کارروائی سے منع کیا۔ ص۷۴ ج۱"

اس سے بھی مولانا طیب صاحب ہی کے بیان کی تائید ہوتی ہے اور مطلب ان کا بھی یہی ہے کہ ابتداء میں اس قاہرہ حکومت کے خلاف بغیر مؤثر اسباب جہاد کیلئے کھڑے ہونے کو مجلس شوریٰ کے ارکان کی اکثریت نامناسب ہی قرار دیتی رہی۔ واللہ اعلم بالصواب مخالفت کرنے والوں کی طرف سے جو نقاط نظر پیش کئے گئے تھے، وہ کیا تھے۔ مولانا طیب صاحب نے اجمالاً بس اتنا لکھا ہے کہ،

"سب نے جو حجتیں خلاف میں پیش کیں، حضرت (نانوتوی) نے جوش کے ساتھ سب کا مسکت جواب دیا"

میرے سامنے نہ مخالفت کرنے والوں کی حجتیں ہیں اور ان حجتوں کا جو مسکت جواب دیا گیا تھا

اس کے علم سے بھی محروم ہوں۔ بظاہر یہی خیال گذرتا ہے، کہ مخالفت کرنے والوں کے سامنے قوت وضعف کا سوال ہوگا، مقابلہ میں ناکامی اور شکست کے سوا جیسا کہ ظاہر ہے اسباب کا اقتضا تھا، کسی دوسرے احتمال کی شکل ہی سے گنجائش پیدا ہو سکتی تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ نبی کے بعد "انتصار" کو مومن کی شان قرآن قرار دے چکا تھا۔ اس کا جواب خود ہی سوچئے کیا دیا جا سکتا تھا۔

بہرحال تھانہ بھون کی اس "مجلس شوریٰ" کے مکالمہ ومباحثہ میں جو کچھ بھی کیا گیا ہو، لیکن آخری نتیجہ سامنے یہی آیا، کہ جس بات کی دعوت دی گئی تھی۔ اس سے اعراض وقعود کی کوئی وجہ وجیہ ارکان کی طرف سے پیش نہ ہو سکی۔ صرف مجلس کے ایک رکن حضرت مولنا شیخ محمد صاحب تھانوی جو حضرت شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے تھے، اور سیدنا الامام الکبیر سے عمر میں بہت زیادہ بڑے تھے۔ مولنا طیب صاحب کی یادداشت میں ہے، کہ انہوں نے آخری عذر یہ پیش کیا، کہ

"اگر آپ کی حجتیں اور باتیں مان لی جائیں، تو سب سے بڑی شرط جہاد میں نصب امام کی ہے۔ امام کہاں ہے کہ اس کی قیادت میں جہاد میں کیا جائے"

سوال بالکل اسلامی روح کے عین مطابق تھا۔ جہاں تک واقعات سے پتہ چلتا ہے، ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں اسی روح کا خیال کم کیا جاتا تھا۔ "ہو" کے ساتھ لوگ اٹھ کھڑے ہوتے تھے، کثرت جب تک وحدت کے نظام میں جکڑی نہیں جاتی۔ صحیح نتائج کی امید مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے دین اور دنیا کے سارے اجتماعی کاروبار میں اسلام کو اس اصول پر جتنا اصرار ہے۔ اس کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ نماز جو ظاہر ہے کہ بندے اور خدا کے دعائی وعبادتی تعلق کا مظہر ہے۔ لیکن اس میں بھی کثرت کو وحدت کے قالب میں ڈھالنے کے لئے امام بنایا گیا ہے۔ سفر میں بھی چند آدمی ساتھ ہوں تو حکم دیا گیا ہے کہ امامت اور امارت کا نظم اس میں بھی قائم کر دیا جائے۔

حدیثوں میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ غیروں کے مقابلہ میں چاہئے کہ مسلمان کید واحدہ (ایک ہاتھ کی شکل میں) اپنے آپ کو پیش کریں، یا دیوار سے تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ہر مسلمان کی

سب ساکت ہو گئے اور متفقہ طور پر سب نے حاجی صاحب کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کی۔"

مولانا عاشق الٰہی مرحوم نے بھی تذکرۃ الرشید میں اسی واقعہ کا ذکر کرنا چاہا ہے، لیکن جس زمانہ میں اپنی کتاب وہ لکھ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ اتنے کھلے الفاظ میں واقعہ کا تذکرہ نہ کر سکتے تھے اور نہ ایسا کرنا مناسب تھا، انھوں نے لکھا ہے کہ "لوگ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ کسی حاکم کی سرپرستی کے بغیر گذران دشوار ہے، اور یہ معروضہ پیش کیا کہ

"آپ چونکہ ہمارے دینی سردار ہیں، اس لئے دنیاوی نظم حکومت کا بار بھی اپنے سر رکھیں اور امیر المؤمنین بن کر ہمارے باہمی قضیئے چکا دیا کریں۔" ص۷۴

یہی مقام ہے، جہاں مولانا عاشق الٰہی کے پیرایۂ بیان میں توریہ کا رنگ پایا جاتا ہے، کہنا وہ بھی یہی چاہتے ہیں کہ حاجی صاحب کے دستِ مبارک پر جہاد کی بیعت کرنے کا ارادہ لوگوں نے پیش کیا، اور اطلاع دیتے ہیں، کہ

"اعلیٰ حضرت کو ان کی درخواست کے موافق ان کے سروں پر ہاتھ رکھنا پڑا۔" ص۷۴

مطلب وہی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے حاجی صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی تجویز پیش کی لوگ راضی ہو گئے، اور حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس تجویز کو قبول کر لیا، یوں وہ اس علاقہ کے مسلمانوں کے "امیر المؤمنین" اور دینی امام ہونے کے ساتھ "سیاسی امام" بھی بن گئے، گویا کثرت منتشرہ کو شرعی حکم کے تحت پہلے وحدت کا قالب امام و امیر کا انتخاب کر کے کیا گیا، اب سارے پراگندہ افراد ایک شیرازے میں منسلک ہو گئے، اور قصہ صرف اسی سرسری تنظیم کی حد تک ختم نہیں کر دیا گیا، بلکہ مولانا طیب صاحب نے مولانا منصور انصاری کے حوالہ سے سیدنا الامام الکبیر کے رفیق مولانا منیر صاحب کی زبانی جو روداد سنائی ہے، اس سے مزید تفصیلات کا بھی پتہ چلتا ہے۔

گویا اجتماعی حیثیت جو ایک وحدانی جسد کے پیکر میں شکل پذیر ہو چکی تھی، چاہا گیا کہ اس کے

تھانہ بھون کی اس مہم میں قاضی عنایت علی ہی کو ہونا چاہیئے تھا، اگرچہ اس باب میں کوئی صریح شہادت مجھے نہیں مل سکی ہے۔

خیر جہاد کی شرعی تنظیم کا مسئلہ تو طے ہوگیا، لیکن شرکت جہاد کے بعض ذیلی شرائط کی تکمیل کا مرحلہ باقی تھا، مطلب یہ ہے، جاننے والے جانتے ہیں کہ والدین یا ان میں کوئی ایک اگر زندہ ہوتو ان سے جنگ میں شریک ہونے کی اجازت بھی شرعاً ضروری ہے۔ ففیھما فجاھد (ان دونوں یعنی والدین کی خدمت گذاری میں جہاد کرو) خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صاحب کو حکم دیا تھا، جن کے والدین زندہ تھے، اور جہاد میں شریک ہونے کی آرزو دربار نبوت میں پیش کی تھی۔

اس باب میں نہ اوروں کا حال ہی مجھے معلوم ہے، اور نہ اس کتاب میں ان کے متعلق ذکر کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ اس شرعی شرط کی تکمیل میں جو صورت پیش آئی، مختلف یادداشتوں میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شرعی تنظیم کے بعد جب طے ہوگیا کہ رزم کا بازار گرم ہوکر رہے گا اللہ ظلم کرنے والوں سے بدلہ بہرحال لیا جائے گا، تو سیدنا الامام الکبیر جن کے والدین اس زمانہ تک زندہ تھے، آپ کے دل میں یہ دینی تقاضا پیدا ہوا کہ والدین سے اجازت کے مرحلہ کو بھی طے کرلیا جائے اسی تقاضے کے زیر اثر تھانہ سے آپ نانوتہ تشریف فرما ہوئے۔ مولوی طاہر صاحب سلمہ نے اپنی یادداشت میں اپنے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد مرحوم کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ،

"۱۸۵۷ء میں جب اس پر اتفاق ہوگیا کہ اس وقت جہاد فرض ہے، تو حضرت اپنے مکان (نانوتہ) تشریف لے گئے، چونکہ اپنی والدہ کے بہت ہی مطیع اور فرماں بردار تھے، روزانہ دونوں وقت پاؤں دبانا ان کا معمول تھا۔"

اس معمول کے مطابق ابھی بھی جیساکہ آگے بیان کیا گیا ہے،

"اپنی والدہ ماجدہ کے پاؤں دباتے ہوئے (ماں کو مخاطب کرکے) فرمانے لگے کہ خدا کی

کی بیعت سے سرفراز ہو کر طریقہ صابریہ چشتیہ کے سیر و سلوک کی تکمیل میں کامیاب ہوئے، اور اس درجہ پر پہنچے کہ بقول مولانا طیب صاحب

"بوقت وفات حضرت میاں جی نور محمد صاحب نے حافظ صاحب کو وصیت فرمائی کہ دیکھنا اپنے چھوٹے بھائی امداد اللہ کا خیال رکھنا۔"

بہر حال آپ وقت کے خدا رسیدہ اور برگزیدہ لوگوں میں تھے۔ لیکن فطری طور پر حد سے زیادہ وارستہ مزاج تھے، لیکن مزاج کی وارستگی اور شگفتہ دلی کا حال یہ تھا، کہ سب کچھ ہو جانے کے بعد مرتے دم تک بلکہ شاید مرنے کے بعد بھی یہ شگفتگی ان کی باقی رہی[۱]، بڑے دل چسپ لطائف ان کی طرف منسوب ہیں، امیر شاہ خاں مرحوم کہا کرتے تھے کہ تھانہ بھون کی وہی مسجد جسے آخر میں حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے قیام نے ہندوستان کا ایک مرکزی مقام بنا دیا تھا، اسی مسجد میں ایک وقت وہ بھی گذرا تھا کہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شیخ محمد تھانوی، حافظ محمد ضامن شہید، ان تینوں بزرگوں کی بیٹھک قریب قریب ہی رہتی تھی۔ حضرت حاجی صاحب اسی مسجد کی متعلقہ سہ دری میں بیٹھتے تھے، اور مولانا شیخ محمد صاحب کی نشست بھی وہیں قریب تھی اور حافظ صاحب مسجد کے قریب ہلکھن تلے بیٹھا کرتے تھے۔ آنے والے جب آتے تو لکھا ہے کہ حافظ صاحب اس کو مخاطب کر کے فرماتے کہ

"بھائی کوئی مسئلہ پوچھنا ہو، تو وہ (مولانا شیخ محمد تھانوی) بیٹھے ہیں، ان سے پوچھ لے، مرید ہونا ہے تو وہ (حاجی امداد اللہ) بیٹھے ہیں، ان سے مرید ہو جا، اور اگر حقہ پینا ہو، تو یاروں کے پاس بیٹھ جا۔" صفحہ ۱۵۶

قصص الاکابر، ارواح ثلاثہ وغیرہ میں حافظ صاحب شہید کے تفصیلی حالات پڑھئے، اس اجمالی

---

[۱] ارواح ثلاثہ میں اس لطیفہ کا ذکر کیا گیا ہے کہ ایک صاحب کشف بزرگ حافظ ضامن شہید کے مزار پر یہ جانے بغیر کہ یہ کس کی قبر ہے فاتحہ پڑھنے گئے۔ فاتحہ سے فارغ ہونے کے بعد لوگوں سے پوچھنے لگے کہ بھائی! یہ کون بزرگ ہیں بڑی دل لگی کی بات کی، میں جب فاتحہ پڑھنے لگا تو کہنے لگے جاؤ، فاتحہ کسی مردہ پر پڑھیو یہاں زندوں پر فاتحہ پڑھنے آئے ہو۔" صفحہ ۱۵۶ لوگوں نے یہ اطلاع دی کہ شہید ہیں۔ تب اس لطیفہ کا مطلب ان کی سمجھ میں آیا۔

قارئ کے بعد میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ شاملی کی گڑھی کے کواڑ کو کوئلہ اور راکھ بناکر گرادیا گیا، اور مجاہدین کو گڑھی میں گھس کر انگریزی فوج کے سپاہیوں سے دست بدست جنگ کرنے کا موقعہ ملا، تو جیسا کہ چاہئے تھا کہ امیر الجیش ہونے کی حیثیت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حافظ شہید کو اندر داخل ہونے والے مجاہدین اور جو باہر تھے، دونوں ہی کی نگرانی کی وجہ سے اندر سے کبھی باہر، اور باہر سے کبھی اندر مسلسل آمد ورفت جاری رکھنے پر مجبور ہونا پڑا، بیان کیا جاتا ہے، کہ آمد وشد کے اسی سلسلہ میں حافظ صاحب گڑھی کے باہر کھلے میدان میں گڑھی کی طرف رخ کئے کھڑے تھے۔ اب واللہ اعلم جان کر مجاہدین کا فوجی افسر یہی ہے یا بے جانے انگریزی فوج کے کسی سپاہی نے گڑھی کی فصیل کہئے یا دیوار پر سے تاک کر ایک ایسی گولی چلائی کہ بقول مولنا طیب صاحب ۔

"گولی ناف پر پڑی"

مولنا عاشق الٰہی کی روایت میں ہے کہ "گولی زیر ناف" لگی تھی، (تذکرہ ص۷۱) بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ سینے پر نشانہ لگایا گیا تھا۔ ٹھیک نشانہ پر تو گولی نہ بیٹھی، اور ناف یا زیر ناف پہنچکر حافظ شہید کے شکم مبارک میں اتر گئی۔ مولنا طیب کی روایت میں ہے کہ گولی لگنے کے ساتھ ہی

"حضرت (حافظ شہید) الکدم اچھل کر زمین پر گرے"

اتنا ہوش اس وقت بھی باقی تھا کہ گرتے ہوئے اس حد تک سنبھال لیا کہ دیکھنے والوں نے دیکھا (جیسا کہ مولنا طیب کی روایت میں ہے کہ)

"بہ ہیئت تشہد زمین پر بیٹھے ہیں"

یہ بھی اسی روایت میں ہے کہ اس وقت یہ بھی دیکھا گیا کہ وہ قبلہ رخ ہیں، جیسے کسی نے نماز کے قعدہ میں آپ کو بٹھادیا ہے" ص جہادی مقالہ

آس پاس جو لوگ کھڑے تھے دوڑ پڑے۔ بیان کیا جاتا ہے، کہ اس وقت بھی اس زخم خوردہ بندۂ حق کی زبان سے جو پہلا فقرہ نکلا وہ یہی تھا کہ

"مجھے مسجد لے چلو، مسجد لے چلو"

نماز کے قعدہ کی ہیئت میں بیٹھے ہیں، اور آرزو صرف اس کی ہے کہ مسجد (سجدہ کی جگہ) تک پہنچادو لطف ع(؟)

نے صرف شعر کہا تھا کہ

سر بوقت ذبح میراان کے زیر پائے ہے

لیکن کر کے دکھانے والا اسی کو آج کر کے دکھانا چاہتا ہے۔ اس کے دل کی آخری تمنا صرف یہی ہے

مولانا عاشق الٰہی نے تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ "حافظ شہید" نے حضرت مولانا گنگوہی کو شاملی کے جہاد

کے موقعہ پر باصرار یہ وصیت کی تھی کہ

"میاں رشید میرا دم نکلے، تو تم میرے پاس ضرور ہونا"

واللہ اعلم مولانا گنگوہی بھی ان لوگوں میں شریک تھے۔ جو حافظ شہید کے گولی کھانے کے بعد

ان کی طرف دوڑ پڑے، یا امیر الجیش کے زخمی ہونے کی خبر آگ کی طرح مجاہدوں میں قدرتاً جب پھیلی

اس وقت آپ مطلع ہوئے، کچھ بھی ہوا ہو، مگر جیسا کہ مولانا عاشق الٰہی صاحب کے بیان سے معلوم

ہوتا ہے "مسجد لے چلو، مسجد لے چلو" کے حکم کی تعمیل کا موقعہ سب سے پہلے مولانا رشید احمد

گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو نصیب ہوا، تذکرۃ الرشید میں ان کے الفاظ ہیں کہ

"حافظ صاحب کا زخم سے چور ہو کر گرنا تھا، اور امام ربانی (حضرت گنگوہی) کا لپک کر تڑپتی

نعش کو کاندھے پر اٹھانا، قریب کی مسجد میں لائے، اور حضرت (حافظ شہید) کا سر اپنے

زانو پر رکھ کر تلاوت (قرآن) میں (مولانا گنگوہی) مصروف ہو گئے"! ص۷۵

آگے ان ہی مولوی عاشق الٰہی نے یہ لکھتے ہوئے کہ "دیکھنے والوں سے سنا ہے" آئندہ کی سرگذشت

کو ان الفاظ میں جو درج کیا ہے کہ

"حضرت مولانا (گنگوہی) کی اس مردانگی پر تعجب تھا کہ کس اطمینان کے ساتھ سنسان مسجد

میں تنہا بیٹھے ہوئے اپنے نور دیدہ چچا (پیر) کے سفر آخرت کا سماں دیکھ رہے ہیں، اور اپنے

عاشق اور محبوب کے نزع کا آخری وقت نظارہ کر رہے تھے۔ آنکھوں میں آنسو تھے اور

زبان پر کلام اللہ۔ یہاں تک کہ حافظ (شہید) رحمۃ اللہ علیہ کا آپ (یعنی مولانا گنگوہی) کے

زانو پر سر رکھے رکھے وصال ہوگیا" ۵؎

اس بیان میں "تنہا بیٹھے ہوئے" کے الفاظ کچھ عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ امیر الجیش کا زخمی ہونا، یقیناً ایسا واقعہ نہیں ہو سکتا، جو آس پاس کے مجاہدوں کی توجہ کو اپنی طرف منعطف نہ کراتا، خود مولٰنا عاشق الٰہی صاحب کا یہ فرمانا کہ "دیکھنے والوں سے سنا ہے" اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کے دیکھنے والے ایک سے یقیناً زیادہ افراد تھے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے دیکھنے والے مسلمان مجاہد تھے جن کا امیر زخموں سے چور ہے، خون میں شرابور ہے، لیکن وہ صرف دیکھتے رہے۔ اور اس کی توفیق کسی کو نہ ہوئی کہ جب حافظ شہید کے خستہ و نزار جسدِ مبارک کو حضرت گنگوہی اپنے کندھے پر اٹھا کر مسجد لے جا رہے تھے۔ ان کا ساتھ دیتے۔ حافظ شہید تو حافظ شہید ہی تھے۔ جیش کے امیر بھی تھے۔ ایسے موقعہ پر عام انسانی فطرت ہے کہ لوگ دوڑ پڑتے ہیں۔ دیکھنے والوں کی یہ غیر فطری سنگدلی میری سمجھ میں نہیں آتی، اسی لئے میرا خیال ہے کہ مولٰنا عاشق الٰہی مرحوم سے بظاہر واقعہ کی تعبیر میں کچھ سامحت ہوئی ہے، اور حافظ شہید جب مسجد میں لائے گئے ہیں۔ اس وقت کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ حضرت گنگوہی تنہا مسجد پہنچے ہوں۔ لیکن واقعہ کے ان "دیکھنے والوں" میں مسجد تک پہنچنے والے کون کون لوگ تھے، ان ناموں کی تفصیل کا تو مجھے علم نہ ہو سکا، تاہم اور کوئی ہو یا نہ ہو یہ ماننا بہت دشوار ہے کہ امیر الجیش کے زخمی ہو کر گر پڑنے کی خبر جب مجاہدین میں پھیلی، تو اس کی خبر سیدنا الامام الکبیر کے گوش مبارک تک نہ پہنچی یا پہنچی، لیکن دوسرے دیکھنے والے تو خبر سننے کے ساتھ دیکھنے کے لئے دوڑ پڑے لیکن ٹھیک اسی ساعت فرخ وقت سعید میں جس میں واقعہ یہ ہے کہ جیش کے امیر کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو پوری ہو رہی تھی گویا ع

کہ یارے برخورد از وصل یارے

۵؎ حضرت مولٰنا حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ سے براہ راست خود فقیر نے بھی سنا ہے، اور قصص الاکابر میں بھی حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بھی یہ روایت منسوب کی گئی ہے، یعنی اپنے سیر و سلوک کی آخری (باقی اگلے صفحہ پر)

تاریخی معرکہ کی تصویر اس میں جھلکتی ہو، اور قلعہ بند ہونے کے بعد احد کا نقشہ ان لوگوں کے سامنے پیش ہو گیا، جو کھلے میدان میں قلعہ بند سپاہیوں کی بندوقوں کی گولیاں کھا کھا کر گر رہے تھے۔ پھر گڑھی کا پھاٹک جب توڑا اور اکھاڑا گیا، اس وقت "خیبر" کے قلعہ کا دروازہ اکھاڑنے والوں کی یاد تازہ ہو جائے۔ یا دیو پیکر انگریزی فوج کا سپاہی جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، جب دو پارہ ہو کر گرا، تو دماغوں میں عرب کے اس سورما کا خیال اگر گھوم جائے جو کچھ اسی طرح دو ٹکڑے ہو کر خندق کے کنارے تڑپ رہا تھا۔ اب خواہ اسے خوش اعتقادی ہی کیوں نہ قرار دیا جائے لیکن جس رنگ میں واقعات پیش آئے۔ قدرتاً ذہنی انتقال میں ان ہی سے مدد مل رہی ہے۔ اپنے اس اضطراری احساس کا کیا کروں، آخری انجام مجاہدوں کی جدوجہد کا شاملی کے میدان میں جو ہوا۔ بظاہر ہزیمت و شکست کے سوا اسے اور کیا سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن عہد سعادت میں موتہ کے میدان میں جو واقعہ پیش آیا، یعنی یکے بعد دیگرے اسلامی لشکر کے افراد شہید ہوتے چلے جا رہے تھے، پہلے حضرت زید، پھر جعفر طیار، پھر عبداللہ بن رواحہ شہید ہوئے۔ آخر میں خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جھنڈا اٹھایا، مگر با ایں ہمہ میدانِ جنگ کے چھوڑنے پر مسلمانوں کو مجبور ہونا پڑا تھا، مگر باوجود پسپائی کے چونکہ ابتری و پراگندگی سے بچاتے ہوئے دشمنوں کے زغہ سے ان مسلمانوں کو حضرت خالد باہر نکال لینے میں کامیاب ہو گئے تھے، ان کی اسی کامیابی کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ففتح لہ | (بخاری) | پس فتح خالد بن ولید کی ہوئی

جس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ کبھی کبھی پسپائی بھی بجائے ہزیمت اور شکست کے "فتح و ظفر" قرار پانے کی مستحق ہوتی ہے۔ عہد نبوت کے اسی نمونہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے شاملی کے میدان سے تھانہ بھون کے مجاہدوں کی واپسی میں جنگ موتہ کی پسپائی کی جھلک محسوس ہو، تو آخر اس احساس کو قطعاً بے بنیاد ٹھہرانے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

آخر خود سوچئے، مجاہدین کی امنگیں مردہ ہو چکی ہیں، ولولے پست ہو چکے ہیں، غنیم کی فوج

"اسی سلسلہ میں حضرت (نانوتوی) کو بھی گولی لگی تھی، اور وہ بھی پٹ پڑی پر، جو انتہائی نازک مقام ہوتا ہے، اس سے ڈاڑھی کے کچھ بال بھی جل گئے، لوگوں نے سمجھا کہ شہید ہو گئے، مگر ایک دم ہمت سے اٹھے، اور چہرے پر ہاتھ پھیرا، تو ایسا تھا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔" ص۵

اسی واقعہ کا تذکرہ مولوی عاشق الہٰی صاحب نے تذکرۃ الرشید میں بایں الفاظ کیا ہے کہ

"حضرت مولانا قاسم العلوم ایک مرتبہ یکایک سر پکڑ کر بیٹھ گئے، بعض نے دیکھا کہ کنپٹی میں گولی لگی، اور دماغ پار کر کے نکل گئی۔"

مزید اضافہ ان کے بیان میں یہ ہے کہ

اعلیٰ حضرت (مراد حضرت مولانا گنگوہی سے ہے، انہوں نے) لپک کر زخم پر ہاتھ رکھا، اور فرمایا "کیا ہوا میاں۔"

مولوی عاشق الہٰی لکھتے ہیں کہ اس کے بعد

"عمامہ اتار کر سر کو جو دیکھا، کہیں گولی کا نشان نہ ملا، اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر۔" ص۵

مولانا طیب اور مولانا عاشق الہٰی کی تو خیر سنی ہوئی روایت ہے۔ لیکن ان سماعی روایتوں کے ساتھ ہم اپنے مصنف امام حضرت مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب میں بھی یہ پاتے ہیں، فرماتے ہیں کہ

"ایک بار گولی چل رہی تھی، یکایک سر پکڑ کر بیٹھ گئے، جس نے دیکھا جانا گولی لگی۔ ایک بھائی دوڑے، پوچھا کیا ہوا، فرمایا کہ سر میں گولی لگی، عمامہ اتار کر سر کو جو دیکھا، کہیں گولی کا نشان نہ ملا، اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر۔" ص۱۳

ہمارے مصنف امام نے جیسا کہ اس وقت کا اقتضاء تھا، اسکی تصریح تو نہیں کی ہے کہ یہ واقعہ کہاں کس موقعہ پر کیسے پیش آیا، لیکن ظاہر ہے کہ شاملی کے میدان ہی کے اسی واقعہ کا ذکر کر رہے ہیں، جس کا تذکرہ مولانا طیب اور مولوی عاشق الہٰی نے کیا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ مصنف امام کی شہادت کے بعد،

واقعہ میں شک کی گنجائش ہی کیا باقی رہتی ہے، ان کے بیان میں "ایک بھائی" سے مراد حضرت مولانا گنگوہی ہیں۔ جن کے نام کی تصریح مولوی عاشق الٰہی نے کی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ مولانا طیب اور مولانا عاشق الٰہی نے تو صرف ایک ہی واقعہ کی حد تک اپنے بیان کو اس سلسلہ میں محدود رکھا ہے۔ لیکن ہمارے مصنف امام نے اس واقعہ کے سوا یہ بھی لکھا ہے کہ

"انہیں دنوں ایک نے منہ در منہ بندوق ماری جس کے سنبھے سے ایک مونچھ اور ڈاڑھی (مولانا نانوتوی) کی جل گئی، اور کچھ قدرے آنکھ کو صدمہ پہنچا، اور خدا جانے گولی کہاں گئی، اور اگر گولی نہ بھی تو تنہا اس کی سنبھ بھی بس تھا، مگر حفاظت الٰہی بر سر تھی کچھ اثر نہ ہوا۔"[1]

جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ غدر ہی کے زمانہ میں یہ دوسرا حادثہ بھی سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ پیش آیا تھا۔

بہرحال حاصل یہی ہے کہ گولی کھانے کے بعد جو کچھ ہونا چاہئے تھا وہ نہ ہوا۔ یہی لوگوں کا مشاہدہ ہے، اب اس کی توجیہ کچھ بھی کی جائے۔ خواہ سیدنا الامام الکبیر کے باطنی تصرف کا نتیجہ اس کو ٹھیرایا جائے جیسا کہ مولانا طیب صاحب کی روایت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ یا حضرت مولانا گنگوہی کی توجہ کو اس میں دخیل مانا جائے، جس کی طرف مولانا عاشق الٰہی کے بیان میں ایما کیا گیا ہے۔ اب خواہ اسباب کچھ بھی ہوں۔ لیکن واقعہ بہرحال پیش آیا، سوال یہی ہوتا ہے، کہ حافظ شہید کے ساتھ بھی اسی طرز عمل یا معالجہ

[1] گولی لگنے کے بعد حضرت والا کے محفوظ رہنے اور محض قدرے خون نکل آنے اور داڑھی مونچھ کے کچھ بال اڑ جانے پر بس ہو جانے کے ظاہری سبب کے بارہ میں مختلف روایتیں بیان کی گئی ہیں۔ مصنف امام کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ گولی کا بے اثر رہ جانا خود حضرت والا ہی کی کرامت تھی۔ میں نے اپنے متعدد بزرگوں سے سنا کہ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ نے حضرت والا کو وارستہ مزاج آزاد اور جوش جہاد میں جان سے قطعاً بے پرواہ دیکھ کر جہاں مولانا محمد منیر صاحب کو ان کے پیچھے پیچھے بطور محافظ بنے پر مامور کیا، وہیں ایک تعویذ بھی دیا کہ اسے پگڑی میں رکھیں۔ بعض ثقات سے مسموع ہوا کہ حضرت حافظ صاحب شہیدؒ نے انگلی سے اپنا لعاب دہن پیشانی پر لگا دیا تھا۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب نے اس سلسلہ میں حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے تصرف کی طرف ایما کیا ہے۔ بہرحال روایات مختلف ہیں۔ لیکن ان میں نہ تعارض ہے نہ ان میں سے کسی روایت کے انکار کی ضرورت۔ حاصل یہ نکلتا ہے کہ حضرت والا کے بڑے اور ہم عصر دوست سب ہی ان کی طرف متوجہ ان کی طرف سے فکر مند تھے اور چاہتے تھے کہ خصوصیت سے وہ محفوظ رہیں (باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

تو کسی مقصد کے لئے، اور مرتے بھی ہیں، تو اس سے بھی کسی نصب العین ہی کی تکمیل مقصود ہوتی ہے، سیدنا الامام الکبیر زندہ رکھے گئے، کہ جس مقصد کے لئے ان کی زندگی تھی ابھی وہ سامنے نہیں آیا تھا، اور حافظ شہید اٹھالئے گئے کہ جس لئے وہ جی رہے تھے ان کی وہی تمنا بے نقاب ہو کر ان کے سامنے آچکی تھی، میں بہت دور نکلا جا رہا ہوں، مجھے واقعہ کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔
مولوی عاشق الٰہی کی اطلاع کے مطابق میدان کارزار سے دوش بدوش ادلتے بدلتے تھانہ بھون تک شہید کی لاش پہنچادی گئی۔ شہید ہونے کی وجہ سے شرعاً نہ کفن ہی کا سوال تھا، اور نہ غسل کا نماز پڑھ دی گئی اور قصبہ کے باہر غالباً جہاں پر حافظ شہید کا جنازہ اتار گیا تھا، زمین کھود کر ان کو سپرد خاک کر دیا گیا، اب بھی بیری کے ایک درخت کے پاس خام قبر شہید کی موجود ہے جس پر فاتحہ پڑھنے کی سعادت فقیر کو بھی حاصل ہوئی ہے۔ وہ چاہیں یا نہ چاہیں۔ لیکن ان کے لئے نہیں لوگ اپنے لئے ان پر فاتحہ پڑھنے کے عادی ہیں[1]۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ مولٰنا طیب صاحب اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں کہ

"ادھر حضرت (حافظ شہید) کی شہادت ہوئی، اور ادھر دہلی سے خبر آئی کہ بادشاہ دہلی گرفتار ہو گئے اور دلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا"۔ ص۸

دلی کے آخری بادشاہ کی گرفتاری، اور زوال اقتدار کے بعد دلی پر انگریزوں کا دوبارہ انتقامی اقتدار و قبضہ کیا تھا، ہندوستان کے لئے عموماً، اور مسلمانوں کے لئے خصوصاً قیام قیامت سے پہلے جاننے والے جانتے ہیں کہ گویا قیامت قائم ہو چکی تھی۔

ان ناقابل بیان، جاں گداز، روح فرسا، ہوش ربا واقعات کی تفصیل سے تاریخ کے خونیں اوراق

---

[1] کشف قبور و کھنے والے صاحب دل کے لطیفہ کا ذکر کر چکا ہوں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا شہداء کے متعلق کچھ اسی قسم کا نقطہ نظر تھا، اسی لئے جنازے کی نماز کی بھی شہید کے لئے ضرورت نہیں سمجھتے تھے لیکن حدیثوں میں جب آیا ہے کہ جنازہ کی نماز کا فائدہ پڑھنے والوں کو بھی حاصل ہوتا ہے۔ مغفرت کی بشارت بعض جنازے کی نماز پڑھنے والوں کو دی گئی ہے اور پڑھنے والوں کیلئے اجر و ذخر صاحب جنازہ بنتا ہے یہی میرا مطلب ہے کہ فاتحہ پڑھنے والوں کی غرض بھی کچھ یہی ہو سکتی ہے حنفی مذہب میں شہیدوں پر بھی جنازے کی نماز اسی لئے پڑھی جاتی ہے کہ پڑھنے والوں کا اس میں فائدہ ہے۔ ۱۲

قتل وقتال، لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا، اور رات کی تاریکی کے چھانے سے پہلے پہلے شہر پناہ کے چاروں دروازے اڑا دئے گئے، اور مکانات پر مٹی کا تیل ڈال کر آگ دے دی گئی۔ ص۲۲

ان الفاظ پر اضافہ کی ظاہر ہے کہ ضرورت ہی کیا ہے؟ تھانہ بھون کا سارا قصبہ دہی جہنم بن گیا جو مظفر نگر کے کلکٹر کے اندر چھپی ہوئی تھی، ان زندہ انسانوں جن کے گھروں سے باہر تو انگریزی فوج کی گولیاں برس رہی تھیں، اور گھروں کے اندر آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ عورتوں، بچوں، بوڑھوں، معذوروں پر کیا گذری ہو گی یا ان حالات میں کیا گذر سکتی ہے، انسان تو اس کے سوچنے کی بھی تاب نہیں لا سکتا، لیکن مظفر نگر کا انگریز عیسائی حاکم نہتوں اور بیکسوں کے ساتھ یہی کر رہا تھا اور کر کے دکھا رہا تھا۔ صرف یہی نہیں کہ گھروں کے اندر آگ تھی، اور گھروں سے باہر بندوقوں کی باڑھ تھی، بلکہ مولانا عاشق الٰہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قصبہ چھوڑ کر جو بھاگنا چاہتے تھے، ان پر بھی راہ گریز اس لئے بند تھی کہ

"عالم کس مپرسی میں نواح وحوالی کے دیہاتیوں کی لوٹ مار اور بے جا حرکتوں، کا زیادہ موقع ملا۔" ص۲۲

گویا ع جائے ماندن ہمہ مقتل شدہ، مسدود مفر

تاہم واقعات بتاتے ہیں کہ سب سے پہلے قصبہ کے رئیس بے چارے قاضی عنایت علی کو دیکھا گیا کہ وہ لاپتہ ہیں، مولانا عاشق الٰہی نے ان ہی کے متعلق یہ خبر دیتے ہوئے کہ

"خدا جانے کہاں گئے، اور کیا ہوئے کچھ پتہ نہ چلا۔"

کہنے والے کہتے تھے جیسا کہ مولانا ہی نے لکھا ہے کہ

"آدھی رات کے وقت قاضی صاحب نے مع چند ہمراہیان کے تھانہ بھون کو خیر باد کہی، اور بسمت نجیب آباد روانہ ہوئے۔"

اگر یہ صحیح ہے، تو یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ ہمالیہ کے کوہستانوں میں قاضی صاحب نے اپنے آپ کو شاید گم کر دیا ہو نجیب آباد جو دامن ہمالہ کی مشہور آبادی ہے اسکی طرف روانگی کا مطلب بظاہر یہی ہو سکتا ہے، واللہ اعلم بالصواب باقی تھانہ بھون کے جہاد کے امیر بیعت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ

اور ان کے دونوں مرید عزیز سیدنا الامام الکبیر اور حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہم ان بزرگوں پر کیا گذری؟

معلومات جو ہم تک پہنچی ہیں، ان کی روشنی میں ان سوالوں کا صحیح جواب دینا، میرے لئے کافی دشوار ہے

مطلب یہ ہے کہ شاملی سے واپس ہونے اور حافظ شہید کے دفن کردینے کے ساتھ ہی یہ حضرات

منتشر ہو گئے، یا تھانہ ہی میں کچھ دن مقیم رہے، پھر حکومت کے نمائندے کی طرف سے جب تھانہ بھون

پر انتقام کی جہنم انڈیلی گئی، اس وقت یہ حضرات کہاں تھے؟

مولانا عاشق الٰہی صاحب کی کتاب میں بھی کوئی واضح جواب ان باتوں کا نہیں ملتا، ان کے بیان سے جو کچھ

بھی معلوم ہوتا ہے، وہ یہی ہے کہ گوئندوں کی مخبری کے بعد

"ان تینوں حضرات کے نام، چونکہ وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے، اور گرفتار کنندہ کے

لئے صلہ تجویز ہو چکا تھا، اس لئے لوگ تلاش میں ساعی اور حراست کی تگ و دو میں پھرتے

تھے۔" صـ۷۳ تذکرۃ الرشید ج ۱

اس سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ تھانہ بھون میں حکومت کی رسائی ان لوگوں تک نہ ہو سکی، اور وارنٹ

جاری کرکے حکومت کے کارندے ان کی گرفتاری کی فکروں میں مشغول ہو گئے، ہمارے مصنف امام

نے اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ سیدنا الامام الکبیر پر دوسری دفعہ بندوق کی گولی جب چلائی گئی،

جس میں مونچھ اور داڑھی کا کچھ حصہ فائر کے سینکے سے جل بھی گیا تھا، اسی سلسلہ میں ان ہی کے حوالہ سے

یہ بھی نقل کر چکا ہوں کہ

"کچھ قدرے آنکھ کو صدمہ پہنچا۔"

آنکھ کے اس "قدرے صدمہ" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصنف امام نے یہ اطلاع دی ہے کہ

"اس زخم کی خبر اجمالی، بعض دشمنوں نے جو سُنی، تو سرکار میں مخبری کی کہ تھانہ بھون کے

فساد میں شریک تھے۔" صـ۴۳

گویا اس "زخم چشم" کو مجرم کی شناخت کی علامت بتانے والوں نے بتائی ہوگی۔ مخبروں کی سماعی گواہیوں

کے ساتھ اس "عینی شہادت" کے قصے نے قدرتاً بہ نسبت دوسروں کے سیدنا الامام الکبیر کے مسئلہ کو

زیادہ اہم بنادیا، لیکن اس اہمیت کا حال سنئے، جونہیں ڈھونڈے جارہے تھے، مولنا طیب صاحب نے "متوسلین وخدام" کے عنوان سے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"متوسلین اور خدام نے عرض کیا کہ احتیاط خلاف توکل نہیں، حضرت روپوش ہو جائیں۔"

مگر انتقام کے زہر سے ملو و معمور حکومت زہریلے، سانپ کی طرح بل کھانے والی جسے ڈھونڈھ رہی تھی، خود اس کا حال کیا تھا۔ مولنا طیب کی اسی یادداشت میں ہے کہ

"حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی فطری شجاعت اور ہمت قلب سے کھلے بندوں پھر رہے تھے۔"

مگر "روپوشی" کے مشورہ دینے والوں کا اصرار حد سے زیادہ بڑھ گیا، تب جیساکہ اسی یادداشت میں ہے،

"اپنی سسرال کے عالیشان مکان (دیوان) میں روپوش ہوئے۔"

لیکن یہ روپوشی جو اصرار بلیغ کے بعد اختیار کی گئی تھی، جانتے ہیں اس کا سلسلہ کتنے دنوں تک جاری رہا، سال و ماہ نہیں، دنوں کے حساب سے لے دے کر حسب روایت مولنا طیب صاحب تین دن سے آگے نہ بڑھ سکا، مولنا کے الفاظ ہیں

"تین دن پورے ہوتے ہی، اکدم پھر باہر نکل آئے، اور کھلے بندوں پھرنے چلنے لگے۔"

ظاہر ہے کہ روپوشی کے سوا، حفاظت و نگہبانی کا کوئی دوسرا ذریعہ جن بے چاروں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ اچانک باہر نکلنے کی اس جسارت پر جتنے بھی سراسیمہ ہوتے، اپنی یافت و عقل کے مطابق اُن کی سراسیمگی بالکل بجا تھی، مولنا طیب صاحب کا بیان ہے کہ

"لوگوں نے پھر بمنت روپوشی کیلئے عرض کیا۔"

اس موقعہ پر سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے جواب میں جس عذر کو پیش کیا گیا تھا، اسی کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ انصاف سے کام لینا چاہئے، شاملی کے میدان کی سطح پر واقعات کا جو تن لکھا گیا تھا، اور فقیر نے عرض کیا تھا کہ تیرہ ساڑھے تیرہ سو سال پیش تر، تاریخ کے پاک ترین عہد میں جو واقعات

سرزمین عرب میں پیش آئے۔ اسی کی شرح مجھے شاملی کے میدان کا یہ تمن نظر آتا ہے۔ اس کو میری ذاتی خوش اعتقادی قرار دینے والوں کو چاہئے کہ سیدنا الامام الکبیر کے اس جواب کو ذرا غور سے پڑھیں دوبارہ روپوشی کی طرف توجہ دلانے والوں سے فرمایا گیا کہ

"تین دن سے زیادہ روپوش ہونا سنت سے ثابت نہیں"

دعوے کی وضاحت کرتے ہوئے یاد دلایا گیا کہ

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے وقت غار ثور میں تین دن ہی روپوش رہے ہیں"

یہ روایت مولنا طیب صاحب کی ہے، اور دار العلوم کے حلقہ میں حضرت والا کے اس جواب کا چرچا تقریباً حد تواتر تک پہنچا ہوا ہے، سوچنا چاہئے کہ اس جہادی مہم کے آغاز ہی سے امارت، بیعت، والدین کی اجازت وغیرہ ہر موقع پر تاریخ کے اسی مقدس دور کی طرف مڑ مڑ کر جو مسلسل دیکھتا رہا ہو، تاآنکہ مہم جب ختم ہوتی ہے، تو دیوان کی ڈیوڑھی کی روپوشی میں "غار ثور" کی تجلی جس کی نظروں کے سامنے تڑپ رہی ہو، الغرض غلام جو قدم بھی اٹھاتا ہو، یہ دیکھ کر اٹھاتا ہو، کہ اس کے آقا نے اپنا مبارک و مسعود قدم کہاں کہاں رکھا تھا، کس طرح رکھا تھا، جس کے ادراک کی لطافت کا اس باب میں یہ حال ہو کہ "مطلق روپوشی" کے جواز کا نتیجہ "غار ثور" کے واقعہ سے جو نکلتا ہے، نتیجے کے اس اطلاق پر اس کا دل راضی نہیں ہے، بلکہ جتنے دنوں تک غار ثور میں روپوشی کا یہ سلسلہ جاری رہا تھا، دنوں کی اس اتفاقی قید کو بھی اتباع سنت کا لازمی جز، کم از کم اپنی ذات کی حد تک قرار دے رہا ہو، اور جوں ہی کہ اسکی روپوشی کی مدت غار ثور والی روپوشی کے حدود سے آگے بڑھنے لگی، جاں گسل روح گداز خطرات کی پروا کئے بغیر اپنی روپوشی کو ختم کر کے باہر نکل گیا ہو، کہنے والے لاکھ سمجھا رہے ہوں، لیکن تین دن سے زیادہ روپوشی پر آخر وقت تک آمادہ نہ ہوا، الغرض جو کچھ کر کے دکھایا گیا تھا، اس کے سوا جو کچھ دیکھنا ہی نہ چاہتا تھا، اگر اسی کو شاملی کے مختصر میدان میں وہ سب کچھ دکھایا گیا، جسے وہ دیکھنا چاہتا تھا، تو جزاءً وفاقاً کے قدرتی قانون کا اقتضا اس کے سوا خود ہی سوچئے کہ اور کیا ہوتا، آخر جس راہ میں چلنے والو

کی قرآنی خبر کی تجربوں سے یوں ہی تصدیق ہوتی رہتی ہے۔

مصنف امام نے اس کے بعد لکھا ہے کہ

"اس کے بعد سے (یعنی دیوان والوں کا گھر سرکاری مخبروں کی نگاہوں پر جب چڑھ گیا تھا)

مسجد میں رہتے"

مسجد سے مراد بظاہر چھتہ کی مشہور مسجد ہی معلوم ہوتی ہے۔ مگر مسجد میں قیام کا یہ زمانہ بھی جس طریقہ سے گذرا، اس کا کچھ اندازہ مولٰنا طیب صاحب کی یادداشت کی اس اطلاع سے ہو سکتا ہے، یہ لکھ کر کہ

"مخبروں کی خبروں سے کہیں نہ کہیں پولیس حضرت کو پا لیتی تھی، لیکن منجانب اللہ حفاظت ہوتی تھی"

اسی سلسلہ میں چھتہ کی مسجد کے قیام کے زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے وہی رقم طراز ہیں کہ

مخبر نے خبر دی کہ حضرت (نانوتوی) چھتہ کی مسجد میں ہیں، دوش آئی، مسجد کا محاصرہ کر لیا،

کپتان پولیس مسجد میں آیا۔ حضرت ٹہل رہے تھے"

یوں کپتان کی نظر آپ پر پڑی اور آپ کی کپتان پر، مولٰنا نے لکھا ہے کہ

"کپتان نے خود حضرت (نانوتوی) سے پوچھا کہ مولٰنا محمد قاسم کہاں ہیں؟"

سیدنا الامام الکبیر کی طرف منسوب کر کے دارالعلوم دیوبند کے حلقوں میں ایک دل چسپ لطیفہ حاضر جوابی کے متعلق جو مشہور ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اسی موقعہ پر اس لطیفہ کا ظہور ہوا تھا۔ لطیفہ ہونے کے ساتھ ساتھ اگر سوچا جائے تو جہادی سنن میں ایک سنت کی تعمیل کی سعادت اس ذریعہ سے حاصل ہوئی، بہر حال ہوا یہ کہ جسے ڈھونڈھ رہا تھا، خود اسی سے اس کا پتہ جب کپتان دریافت کر رہا تھا، گویا غالب والی بات ہے

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے   کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

کچھ یہی صورت جب پیش آئی تو جیسا کہ مولٰنا طیب نے لکھا ہے سیدنا الامام الکبیر نے

"ایک قدم ہٹ کر فرمایا کہ ابھی یہیں تھے دیکھ لیجئے"

حضرت ٹہل رہے تھے۔ ٹہلنے والے کا ہر دوسرا قدم ظاہر ہے کہ اس جگہ پر نہیں پڑتا، جہاں وہ پہلے

ہوتا ہے جس جگہ کو چھوڑ چکے تھے۔ اسی جگہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا گیا کہ "یہیں تھے" جو بالکل واقعہ کے مطابق بات تھی، "دیکھ لیجئے" یعنی جسے ڈھونڈھ رہے ہو اسے تم دیکھ بھی سکتے ہو لیکن جہاں

تراھم ینظرون الیک وھم لا یبصرون	تو دیکھتا ہے کہ وہ تجھے دیکھ رہے ہیں لیکن انھیں سوجھ نہیں رہا تھا۔

کپتان غریب دیکھ رہا تھا۔ لیکن جسے ڈھونڈھ رہا تھا، وہ اسے سجھائی نہ دیا، اور بقول مولانا طیب صاحب

"کپتان دیکھ بھال میں مصروف ہوا"

زور جو دیکھا ہوا تھا، اس کو کپتان کی نظروں سے اوجھل ہونے کا موقعہ مل گیا، اور یوں

"حضرت (نانوتوی) غایتِ اطمینان سے مسجد سے باہر نکل آئے، اور پولیس کے گھیرے میں سے گذرتے ہوئے دوسری قریب کی مسجد شاہ رمز الدین کی طرف روانہ ہو گئے"۔

اس عرصہ میں کپتان بھی مسجد سے باہر نکلا، اب واللہ اعلم کیا صورت پیش آئی، اور کس علامت سے اس نے پہچانا، مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں ہے کہ

"کپتان مسجد سے باہر نکلا، اور حضرت کو جاتے ہوئے دیکھ کر بولا، کہ مولانا تو یہی معلوم ہوتے ہیں، جو جا رہے ہیں، پولیس ادھر چلی، اور مسجد شاہ رمز الدین کا محاصرہ کر لیا"۔

آگے جو صورت پیش آئی یعنی لکھا ہے کہ

"حضرت وہاں (مسجد شاہ رمز الدین) سے نکلے اور پولیس کے جتھے میں سے گذرتے ہوئے کسی اور مسجد میں پہنچ گئے"۔

کپتان کے یہ کہنے کے باوجود کہ "مولانا یہی معلوم ہوتے ہیں" پولیس کے جتھے سے گذرتے ہوئے نکل جانے کی توجیہ میں بجز اس کے کہ

وجعلنا من بین ایدیھم سدا ومن خلفھم سدا فاغشیناھم فھم لا یبصرون	اور ہم نے ایک آڑ ان کے سامنے کر دی اور ایک آڑ ان کے پیچھے کر دی جس ہم نے (ہر طرف سے) ان کو (پردوں سے) گھیر دیا۔ سو وہ (کسی چیز کو) نہیں دیکھ سکتے۔

جیسا کہ چاہیے تھا،

"دوش چکوالی پہنچ گئی، پولیس نے گاؤں کا محاصرہ کر لیا"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ خود شیخ نہال احمد مرحوم بھی بطور رفاقت کے اسی گاؤں میں مقیم تھے۔ گاؤں کا محاصرہ پولیس والوں نے کر لیا ہے۔ اس واقعہ سے واقف ہونے کے ساتھ ہی جیسا کہ مولانا طیب صاحب کا بیان ہے۔

"شیخ نہال احمد صاحب کے تو چھکے چھوٹ گئے، سخت خائف اور ہراساں ہوئے"

لیکن خوف و ہراس کی اس کیفیت میں بقول مولانا طیب صاحب شیخ صاحب کے اس احساس کو زیادہ دخل تھا کہ

"مولانا (نانوتوی) کی گرفتاری میرے گاؤں میں ہو، جس میں میں ہی خود حضرت کو باصرار لے کر آیا ہوں"

لکھا ہے کہ شیخ صاحب کی پریشان حالی کو دیکھ کر حضرت نانوتوی نے ذرا درشت لہجہ میں فرمایا کہ

"اس طرح خوف زدہ صورت بنا کر تو آپ مجھے پکڑوا کر رہیں گے"

اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا کہ

"آپ بالکل مطمئن رہیں، میں اپنا بچاؤ خود کر لوں گا"

چکوالی میں شیخ صاحب کا جو مکان تھا، اس میں بھی زنانہ مردانہ دو حصے تھے۔ حضرت والا کو لیکر شیخ صاحب اسی زنانہ حصہ میں رہا کرتے تھے۔ شیخ صاحب کو تو اسی زنانہ حصہ میں چھوڑ کر بے دھڑک لکھا ہے کہ

"حضرت (نانوتوی) باہر نکل آئے"

سامنے پولیس کا کپتان کھڑا تھا، نظر پڑتے ہی، بغیر کسی اضطراب اور گھبراہٹ کے کپتان کو مخاطب بناتے ہوئے فرمانے لگے

"آئیے آئیے تشریف لائیے"

صرف یہی نہیں بلکہ اسی کے ساتھ روایت میں یہ بھی ہے کہ کپتان صاحب کے لئے چارتیار کرنے کا حکم بھی صادر فرمایا۔ چارتیار ہو کر آئی، پلائی گئی، کپتان بھی آپ سے مانوس ہو کر پوچھتا رہا کہ

"آپ مولانا محمد قاسم صاحب سے واقف ہیں"

جواب میں یہ کہتے ہوئے کہ

"جی ہاں میں ان کو خوب جانتا ہوں"

مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ

"اپنی زبان سے اپنے مناسب وقت حالات بیان فرماتے رہے"

اس پر کپتان نے کہا کہ

"ہم زنانہ مکان کی تلاشی لینا چاہتے ہیں"

ظاہر ہے کہ تلاشی جس کے لئے کپتان صاحب لینا چاہتے تھے وہ تو ان کو ملا ہوا تھا، زنانہ مکان میں انکو ان کا شکار کہاں ملتا۔ بخندہ جبینی ارشاد فرمایا گیا

"شوق سے تلاشی لے سکتے ہیں"

لکھا ہے کہ کپتان زنانہ حصہ میں داخل ہوا، اور

کونہ کونہ چھان مارا"

لیکن جو کھویا ہوا ہوتا، اسے البتہ پا سکتا تھا۔ مگر جسے پائے ہوئے تھا، وہ اس کو کھویا ہوا سمجھ کر ڈھونڈ رہا تھا۔ اس ڈھونڈھ اور تلاش کا جو نتیجہ ہو سکتا تھا، وہی ہوا۔ لطف یہ ہے جیسا کہ مولانا طیب کی یادداشت میں ہے کہ

"حضرت (نانوتوی) کپتان کے ساتھ ساتھ تلاشی دلانے میں مصروف تھے" ؎ ۱

ناکامی اور نامرادی کے ساتھ غریب زنانہ مکان سے واپس ہوا، جب تلاش و جستجو کے سارے مراحل ختم ہو گئے، اور کپتان چکوالی سے رخصت ہونے لگا، تو لکھا ہے کہ

"حضرت بھی اس سے رخصت ہو کر نانوتہ روانہ ہو گئے"

تگ ودو گیج وکاؤ کے بعد یہ ناکامی ونامرادی کپتان کے لئے کافی ہیجان انگیز، اور تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ نزلہ کے گرنے کے لئے مخبر کا ضعیف وجود اس کے ساتھ تھا، بیان کیا گیا ہے کہ اسی "عضوِ ضعیف" کو مشق کا تختہ بنا کر

"کپتان نے بہت ڈانٹا، کہ تو غلط خبریں دیا کرتا ہے"

مخبر نے اس وقت کپتان صاحب سے عرض کیا کہ

"آپ نے غور نہیں کیا، کہیں مولٰنا ہی صاحب تو نہ تھے، جنہوں نے تلاشی دلوائی"

جب ٹِگ کر چڑیا کھیت سے اُڑ چکی تھی، اس وقت مخبر صاحب بھی چونکے تھے، اور ان کی توجہ دلانے سے کہتے ہیں کہ

"کپتان نے وارنٹ جیب سے نکال کر حلیہ پڑھا تو حضرت نانوتوی کے چہرے مہرے پر منطبق پایا"

مگر نانوتہ اور اس کے گرد و نواح کے گھپ اندھیرے گھنے نخلستانی جنگل کو جس نے دیکھا ہے وہی سمجھ سکتا ہے کہ چکوالی سے نکل جانے کے بعد راستہ میں گرفتار کرنا آسان نہ تھا۔ غصہ میں کپتان نے حکم دیا کہ دوبش نانوتہ کی طرف مارچ کرے۔ مولٰنا طیب صاحب کا بیان ہے کہ لوگ پہلے ہی سے لگے ہوئے تھے، قبل اس کے کہ دوبش نانوتہ پہنچے، سیدنا الامام الکبیر کو اطلاع ہو گئی اور بقول مولٰنا طیب

"دوسرے راستہ سے دیوبند پہنچ گئے"

پیدل چلنے پھرنے کی عادت آج کام آ رہی تھی، ابھی چکوالی میں تھے، چکوالی سے نانوتہ پہنچے ابھی سانس لینے بھی نہ پائے تھے، کہ وہاں سے بھی روانہ ہو گئے، اور دم کے دم میں چوبیس میل کے دراز فاصلہ کو طے کر کے حضرت والا دیوبند میں رونق افروز تھے

ہر پھر کر پولیس والوں نے پھر دیوبند ہی کی مسجدوں میں آپ کا سراغ لگانا چاہا۔ لیکن یہاں وہی ایک مسجد سے دوسری مسجد، دوسری مسجد سے تیسری مسجد کا چکر جاری رہا، پولیس بھی گھومتی رہی لیکن گھومنے کے سوا جسے ڈھونڈھ رہی تھی اس کے پانے میں آخر وقت تک کامیاب نہ ہوئی۔

مولانا طیب نے لکھا ہے

"غرض پولیس کو چکر میں رکھا، اور گرفتار نہ ہوئے"

اس قسم کے قصوں کا سنانا بھی آسان ہے اور سن لینا بھی آسان ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس کا قصہ سنایا گیا خود وہ جس آسانی کے ساتھ ان جاں فرسا ہائلہ حوادث سے گذر رہا تھا، ہر شخص کے لئے گذرنا آسان نہیں ہے، بے پناہ قوت رکھنے والی ملوکیت کے سامنے سینہ تان کر انتہائی لاپروائی کے ساتھ صحیح معنوں میں وہی ٹھہر سکتا ہے، جس پر السموات والارض کی ملکوت (بادشاہت) کا صحیح راز آشکارا ہو چکا ہو۔ پہاڑ بھی اس کے قدموں کے نیچے پانی بن جاتے ہیں۔ اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ اسی کا تماشا کیا نہیں دکھایا جا رہا ہے، کچھ ٹھکانا ہے اس سکینت قلب، جمعیت خاطر کا کہ وارنٹ جیب میں رکھے ہوئے گرفتار کرنے کے لئے جو آیا ہوا ہے، اسی کو چائے پلائی جاتی ہے اور جس کو گرفتار کرنا چاہتا ہے، وہی گرفتاری کی کارروائیوں میں گرفتار کرنے والے کی مدد کر رہا ہے، یہ سب کچھ ہو رہا ہے، لیکن بظاہر جس کا کوئی پشت پناہ نہیں ہے، اس کو گرفتار کرنے میں وہی قطعاً ناکام ثابت ہوا جسے ظاہر من فی الارض اور ملک کی سب سے بڑی قاہرہ سیاسی قوت کی پشت پناہی حاصل تھی۔

خیر سیدنا الامام الکبیر تو ادھر دیوبند، نانوتہ اور چکوالی کے ادرے پھیرے میں مصروف تھے لیکن آپ کے پیر و مرشد امیر جہاد حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے "حرمین کی نیت سے گھر (تھانہ) کو باہر نکل چکے تھے"۔ بقول مولانا عاشق الٰہی

"چند ماہ انبالہ، تگری، پنجلاسہ وغیرہ مواضع و قصبات میں اپنے آپ کو چھپایا، اور آخر براہ سندھ کراچی عرب کا راستہ لیا۔" صـ تذکرۃ الرشید

یہی چند ماہ جو حضرت حاجی صاحب کے ان مقامات میں گذرے، اسی زمانے میں سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ پولیس کے تعاقب کے مذکورہ بالا قصے پیش آ رہے تھے۔ ہمارے مصنف امام نے بھی ان ہی اوقات کی طرف اجمالی اشارہ کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے کہ

رکھتے ہوئے گویا آنکھوں سے محروم کر دیا گیا ہے۔ عدم تعرض میں یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ کچھ اسی قسم کی وہ حیثیتوں کو زیادہ دخل تھا، اور سچ تو یہ ہے کہ ایک مسجد سے نکل کر جب بجائے کسی دوسرے مقام کے مسجد ہی آپ کی قرار گاہ ہوتی تھی "تو" مسجد میں رہتے تھے "اس کے سوا اور اس واقعہ کی تعبیر ہی کیا کی جا سکتی ہے

بہر حال میرا صرف یہ خیال ہی نہیں ہے کہ اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں حاضری کے لئے مذکورہ بالا مقامات میں سیدنا الامام الکبیر نے اپنی آمد و رفت کے سلسلہ کو جاری رکھا تھا۔ بلکہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مولوی عاشق الٰہی صاحب نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

"اپنے ہادی برحق (حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ) کی ہندوستان میں آخری زیارت کے شوق سے بے تاب ہو کر انبالہ نگری اور پھلاسہ کے سفر کو اٹھے اور دستور الحال مخفی طور پر اس حق کو ادا فرما کر واپس وطن (گنگوہ) ہوئے" ص۵۱

اس خبر سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے کہ ان مقامات کا سفر حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کے لئے اختیار کیا جاتا تھا، پیادہ پا چلنے کے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ چونکہ زیادہ عادی نہ تھے۔ شاید اسی لئے آپ کو اس سلسلہ میں ایک ہی دفعہ سفری صعوبتوں کی زحمت برداشت کرنی پڑی۔ مشکلات راہ کو عشق کی کشش نے آسان کیا۔ اس سفر کی دشواریوں کا اندازہ اسی سے کیجئے۔ دوسری جگہ مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ

"راتوں کو چلتے، دنوں چھپتے، خاردار جنگل، پیدل قطع کرتے" ص۵۲

اور اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ جمنا پار کے ان ہی مقامات کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف امام نے سیدنا الامام الکبیر کے متعلق جو لکھا ہے کہ

"کئی دفعہ آئے گئے"

اس کئی دفعہ کے آنے جانے میں کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا، مگر ابتدائے زندگی سے پیدل چلنے کے چونکہ آپ عادی تھے۔ کسی موقعہ پر لکھ چکا ہوں کہ پیادہ پا چلنے کی اسی عام عادت کی وجہ سے آپ کے والد ماجد شیخ اسد علی کے دل میں کافی گرانی بھی پائی جاتی تھی۔ لیکن اسی قسم کے نازک مواقع پر کام لینے

قاتلوں کے پناہ دینے، باغیوں کی سرداری، بغاوت کی ترغیب ان الزاموں سے بری ہونے کی صورت کیا تھی، خود ان پر بھی یہ سارے الزامات تھے، اور جو فردِ جرم آپ کے جاں باز دست گرفتوں سیدنا الامام الکبیر اور محدث روشن ضمیر حضرت مولٰنا رشید احمد گنگوہی پر لگائی گئی تھی، اس کی فہرست بھی بجنسہ یہی تھی۔

ایسی صورت میں مان بھی لیا جائے کہ عرب روانہ ہونے سے پیشتر اس "عام معافی نامہ" کا اعلان ہو بھی چکا ہو، جب بھی نہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کے مطمئن ہونے کے لئے کافی تھا اور نہ ان کے دونوں نوجوان خدام رفیقوں کے لئے۔ اسی لئے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی نگاہوں سے ہٹے اور ٹلے رہنے کا سلسلہ تینوں صاحبوں کے لئے معافی نامہ کے اعلان کے بعد بھی جاری رہا۔ حاجی صاحب تو کسی نہ کسی طرح کراچی سے بادبانی جہاز پر سوار ہو کر مکہ معظمہ پہنچ گئے، مولوی عاشق الٰہی صاحب نے بغیر کسی تعیین تاریخ کے صرف یہی لکھا ہے کہ

"اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ) نے چند ماہ انبالہ نگری پنجلاسہ وغیرہا مواضع وقصبات میں اپنے آپ کو چھپایا، اور آخر براہ سندھ وکراچی عرب کا راستہ لیا ہندوستان کو خیرباد کہی، اور ہوائی جہاز پر سوار ہو کر مکہ معظمہ پہنچے۔" ص

ہوائی جہاز بادبانی جہاز کی عاشقانہ تعبیر ہے۔ ان بے چاروں کو کیا معلوم تھا کہ پانی سے بے تعلق ہو کر صرف ہوا پہ چلنے والا جہاز بھی سامنے آنے والا ہے۔

بہر حال جہاں تک میرا خیال ہے حاجی صاحب کی روانگی جس خاص طریقہ سے اس زمانہ کی سست رفتار سواریوں پر ہوئی تھی اور جن حالات میں ہوئی تھی چاہئے تو یہی کہ ہند کے ان مختلف مقامات سے گذرتے ہوئے عرب تک پہنچنے میں مدت صرف ہوئی ہو۔ سال ڈیڑھ سال بھی یہ مدت اگر فرض کی جائے، تو قیاس کا اقتضاء یہی ہے کہ زیادہ نہ ہو۔

رہے ان کے صاحبین (حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ)، تو ان میں سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق اگرچہ عام طور سے یہ مشہور ہے کہ امن عام کے اعلان کے بعد ہی حکومت نے اپنی

نگرانی آپ سے ہٹالی تھی، غدر کے ہنگامہ کے فرو ہو جانے کے بعد حضرت والا جن خدمات کی طرف متوجہ ہوئے، ان کا ذکر کرتے ہوئے مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں جو یہ الفاظ پائے جاتے ہیں کہ

"یہاں تک کہ ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے امن عام کا مشہور اعلان ہو گیا، اور ہر شخص آزادی سے چلنے پھرنے لگا۔" صلا

بظاہر اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر کو بھی آزادی کے ساتھ چلنے پھرنے کا موقعہ گویا مل گیا تھا، اور یوں بغیر کسی روک ٹوک کے ان مہمات میں مشغول ہوئے جن کی باگ غدر کے بعد آپ کے مبارک ہاتھوں میں آئی۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ مصنف امام نے حضرت والا کی سوانح عمری میں آپ کے حج اول کا تذکرہ کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے، اس سے قطعی طور پر اس کی تردید ہوتی ہے، مگر سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ لوگوں میں یہی بات کیوں پھیلی رہی، کہ ملکہ وکٹوریہ کے اس اعلان کے بعد ان خطرات سے محفوظ ہوگئے تھے جنھیں حکومت کے وارنٹ نے آپ کے لئے پیدا کر دیا تھا۔

میرا مطلب یہ ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر کے پہلے حج کے متعلق یہ بیان کرتے ہوئے کہ اس سفر میں وہ بھی آپ کے ساتھ تھے۔ مصنف امام نے ہندوستان سے روانگی کی تاریخ ۱۲۷۷ھ ماہ جمادی الثانی بتائی ہے۔ گویا سن عیسوی کے حساب سے ۱۸۶۰ء دسمبر کا مہینہ تھا، حساب کر کے دیکھ لیجئے اب اسی کے ساتھ وہ یہ بھی اطلاع دیتے ہیں کہ حج کے اس سفر کی

"روپوشی کی بلا کے سبب والدین نے بخوشی اجازت دے دی۔" صلا۱۹

جس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ۱۸۶۰ء کے آخری مہینہ دسمبر تک "روپوشی کی بلا" سیدنا الامام الکبیر کے پیچھے لگی ہوئی تھی، اگرچہ "تین دن کی اختیاری روپوشی" کے بعد آپ کی روپوشی بھی برائے نام تھی، اور وہ بھی بقول مصنف امام جیسا کہ اس موقعہ پر بھی انہوں نے لکھا ہے کہ

"مولانا کی روپوشی محض عزیز و اقارب کے کہنے سے تھی، ورنہ ان کو اپنی جان کا کچھ خیال نہ تھا۔"

خبر دی ہے کہ ہم لوگوں کا سوار ہونا

"رمضان کا چاند دیکھ کر"

ہوا تھا۔ گویا یکم رمضان کو جہاز میں داخل ہوئے، اور وہی قرآن جو دو سال سے یاد کیا جا رہا تھا۔ تراویح میں اسی کے سنانے کا پہلا موقعہ اسی جہاز میں ملا تھا۔ مصنف امام کے الفاظ ہیں

"مولوی صاحب نے قرآن شریف یاد کیا تھا، اول وہاں (جہاز میں) سنایا"[1] ص ۳۸

ختم تراویح کے موقعہ پر مٹھائی کی تقسیم کا جو عام دستور ہے، ظاہر ہے کہ جہاز میں اس کا کیا سامان ہو سکتا تھا، لیکن یہ بادبانی جہاز عرب کے ساحلی مقام حضر موت کی راج دھانی کے سامنے جس کا نام مکلّہ ہے کچھ دن کے لئے لنگر انداز ہوا، تو مصنف امام راوی ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر نے

"بعد عید مکلّہ پہنچ کر حلوائے مسقط خرید فرما کر (بطور) شیرینی ختم دوستوں کو تقسیم فرمایا" ص ۳۸

الغرض اور عام لوگوں سے علاحدگی کے ان دنوں میں حفظ قرآن کا یہ پاک مشغلہ حضرت والا کا جو جاری تھا، اس کے متعلق یہ خبر دیتے ہوئے کہ

"مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) کا اس سے پہلے (یعنی جہاز میں قرآن سنانے سے پہلے) قرآن یاد کرنا کسی کو ظاہر نہ ہوا تھا، آہستہ آہستہ پڑھتے اور یاد کر لیتے" ص ۳۸

اسی کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ

"حافظوں کے نزدیک ٹھیرا ہوا ہے کہ (قرآن) بلند آواز سے یاد ہوتا ہے" ص ۳۸

لیکن سن رسیدہ ہونے اور آہستہ آہستہ یاد کرنے کے باوجود ان کی یہ شہادت ہے کہ

"جب سنایا، ایسا صاف سنایا، جیسے اچھے پرانے حافظ" ص ۳۸

قرآن آپ نے کس لئے یاد کیا تھا، قطع نظر دوسرے اسباب ووجوہ کے فقیر نے جو یہ عرض کیا تھا کہ

---

[1] دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں ہو سکتا ہے کہ قرآن شریف یاد دو رمضانوں میں کیا ہو جو مفاد ہے، مصنف امام کی روایت کا اور روزانہ ایک ایک پارہ صاف کیا ہو، اس رمضان میں جس میں تراویح جہاز میں سنائی جو مفاد ہے مشہور روایت کا۔ محمد طیب غفرلہ

کیسے ہوتا رہا۔ افسوس ہے کہ بجائے تفصیل کے مصنف امام نے اس کے جواب میں صرف یہ اجمالی الفاظ درج کئے ہیں کہ

"بدولتِ توکل سب راہ بخیر وخوبی پوری ہوئی اور سب کام انجام ہو گئے۔" ص۳۸

اپنے اس توکل میں بنانے والے نے جسے اپنا وکیل بنایا تھا، اس نے اپنی وکالت کا حق کس طرح پورا کیا؟ حقیقت تو یہ ہے کہ کافی ایمان افروز واقعات ہوں گے، لیکن دیکھنے والوں ہی نے جب بیان نہیں کیا تو جس نے نہیں دیکھا وہ کیا بتائے۔ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے، کہ کافی خوشی اور خرمی انبساط و نشاط ہی کے ساتھ یہ سفر پورا ہوا تھا۔ جہاز میں تراویح کا ہنانا "مکلا پہنچکر سقلی حلوا خرید کر احباب میں ختم تراویح کی شیرینی کے طور پر تقسیم انبساط و انشراح قلب کی غمازی کر رہی ہے پراگندہ دلی و افسردگی میں ان باتوں کی بھلا کیا گنجائش؟ بلکہ اسی موقعہ پر بے ساختہ یہ جملہ معترضہ ان کے قلم سے جو ٹپک پڑا ہے، یعنی "جہاز میں کیا سیر تھا!" ص۳۸ خود اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کافی سرور و نشاط کے ساتھ سفر پورا ہو رہا تھا۔

بہر حال جیسا کہ مصنف امام کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں کہ حج و زیارت کے اس مقدس سفر میں کم و بیش ایک سال کی مدت صرف ہوئی، ۱۸۵۷ء کے فتنہ پر گویا سمجھنا چاہئے تقریباً چار یا پانچ سال گذر چکے تھے ۱۸۶۰ء میں حضرت کی روانگی ہندوستان سے ہوئی تھی اور ۱۸۶۱ء میں واپسی ہوئی۔ اس عرصہ میں ہندوستان کی سیاسی حالت روز بروز بدلتی چلی جا رہی تھی، انتقام کی آگ حکومت کے سینے میں روز بروز جیسا کہ چاہئے تھا قدرتاً دھیمی پڑتی رہی۔ بیسیوں مجرمین جن کے نام عام معافی نامہ کے اعلان کے بعد بھی استثنائی فہرست سے نہ نکلے تھے۔ تدریجاً نکلتے چلے جا رہے تھے۔ اب کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کیا واقعہ پیش آیا، کہ حجاج کا وہی قافلہ جو پنجاب والی خشکی وتری کی راہ سے کراچی اور وہاں سے بادبانی جہاز پر حجاز پہنچا تھا، اسی کے پاس کس قسم کی اطلاعیں ہندوستان سے پہنچی تھیں، کہ اسی قافلہ کو یعنی سیدنا الامام الکبیر اور آپ کے رفقاء سفر کو دیکھتے ہیں کہ واپس لوٹتے ہوئے، بجائے کراچی کے بندر کے مصنف امام کا بیان ہے کہ

"مراجعت براہ بمبئی اور ناسک ہوئی، ریل ناسک تک تھی، وہاں سے گاڑیوں میں آئے"۔ ص۳۷

ان ہی کی اطلاع یہ بھی ہے کہ

"ربیع الاول کے آخر میں بمبئی آئے۔ جمادی الثانی تک وطن پہنچے"۔ ص۳۸

گویا بمبئی سے وطن تک پہنچنے میں دو ڈھائی مہینے صرف ہوئے،

اگرچہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ بمبئی کی راہ سے یہ واپسی بھی "روپوشی" ہی کی شکل میں تھی یا یہ قصہ ختم ہو چکا تھا۔ لیکن قرائن کا اقتضا اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی نگرانی میں اضمحلال اور لاپروائی کی کیفیت ضرور پیدا ہو چکی تھی۔ اسی حج کے سفر سے واپسی کے تذکرے کو ختم کر کے مصنف امام نے لکھا ہے کہ،

"پیچھے بعد تحقیقات سرکار نے مطالبہ عام اٹھا دیا تھا، چند خاص شخصوں کی نسبت جن پر سرکار کا شبہ قوی تھا اشتہار جاری رہا"۔

واللہ اعلم بالصواب "پیچھے" کے لفظ سے ان کی کیا مراد ہے، بظاہر تو یہی سمجھ میں آتا ہے، کہ ان لوگوں کے پیچھے جب وہ عرب میں تھے۔ حکومت کی طرف سے تحقیقات کے بعد "مطالبہ" کی گرفت ڈھیلی کر دی گئی تھی، اور صرف چند مخصوص شخصیتوں کی حد تک قصہ محدود ہو کر رہ گیا تھا۔

مصنف امام کے اس بیان کے سوا اس وقت تک مجھے کوئی ایسی چیز نہیں ملی ہے جس میں صراحۃً اس کا ذکر کیا گیا ہو، کہ سیدنا الامام الکبیر کے اسم گرامی کو استثنائی مجرموں کی فہرست سے نکال دیا گیا تھا۔ بس ان کے بیان کے فحویٰ سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ حج کے سفر سے واپسی کے بعد سیدنا الامام الکبیر کے لئے کسی قسم کا کوئی خطرہ باقی نہ رہا تھا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ حج سے واپس ہونے کے بعد حضرت والا

"پھر گھر پر اپنے رہے"۔ ص۳۹

سمجھنا چاہئے کہ اسی نقطہ پر ۵۷ء کے جہاد کی مہم آپ کی ختم ہو گئی۔

باقی رہے حضرت حاجی صاحب کے صاحبین میں سے دوسرے صاحب یعنی قطب ربانی حضرت مولانا

رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تو جہاں تک میرا خیال ہے ملکہ وکٹوریہ کے عام معافی نامہ کے اعلان کے بعد بھی اپنے رفیق سیدنا الامام الکبیر کی طرح آپ کا شمار بھی ان ہی استثنائی مجرموں میں تھا، جو اس معافی نامہ سے مستفید ہونے کا حق نہیں رکھتے تھے۔ جیسا کہ معلوم ہے حضرت گنگوہی کو حکومت نے گرفتار بھی کر لیا تھا، اور حوالات میں ڈال کر چھ مہینہ تک آپ پر باضابطہ مقدمہ چلتا رہا، غیبی امداد سرگرم کار تھی، نہ بڑے بڑے وکیل تھے اور نہ بیرسٹر۔ لیکن اس آفت ناگہانی سے بخیر و خوبی آپ سالم و غانم ہو کر نکل آئے۔ جس کی تفصیلات تذکرۃ الرشید میں پڑھنا چاہئے۔ یہاں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ حضرت گنگوہی کی گرفتاری کا ذکر کرتے ہوئے مولوی عاشق الہٰی نے لکھا ہے کہ

"تخمینے سے یہ زمانہ ۱۲۷۵ھ ہجری کا ختم یا ۱۲۷۶ھ کا شروع سال ہے" ص۸۲

اگر یہی واقعہ ہے تو عیسوی سن کے حساب سے یہ ۱۸۵۸ء کا آخر اور ۱۸۵۹ء کی ابتدا کا زمانہ ہے، اور عرض کر چکا ہوں کہ ۱۸۵۸ء کے نومبر ہی میں عام معافی نامہ کا اعلان حکومت برطانیہ کی طرف سے ہندوستان میں کیا جا چکا تھا۔ ایسی صورت میں سمجھنا چاہئے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ پر مقدمہ عام معافی نامہ کے اعلان کے بعد چلایا گیا۔

حضرت مولنا گنگوہی کی گرفتاری کے زمانہ میں جو واقعات پیش آئے جن کا ذکر مولوی عاشق الہٰی صاحب نے کیا ہے۔ آج بھی ان کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بستر سواروں کو ساتھ لیکر ایک مسلمان غلام علی نامی کی مخبری اور راہ نمائی میں کرنل گارڈن نے گنگوہ پر دھاوا کیا، مولنا گنگوہ میں موجود نہ تھے۔ لیکن ان کے اشتباہ میں حضرت کے ماموں زاد بھائی مولوی ابو النصر صاحب مرحوم کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ جو مسجد کے کسی گوشہ میں گردن جھکائے بیٹھے تھے۔ مولوی عاشق الہٰی کی روایت ہے کہ سواروں میں سے ایک سوار نے مولوی ابو النصر

"کی گردن پر زور سے ہاتھ مارا اور پکارا کہ چل کھڑا ہو، گردن جھکائے کیا بیٹھا ہے" ص۸۲

مولوی ابو النصر حالانکہ جانتے تھے کہ مولنا گنگوہی کے شبہ میں مجھے گرفتار کر رہا ہے۔ لیکن اس مرد خدا

اللہ کے بندے کی زبان سے یہ نہ نکلا کہ

"میں رشید احمد نہیں ہوں"

اخلاص و وفا کی یہ مثالیں سلف[1] میں تو سننے میں آئی ہیں۔ لیکن روح القدس کا فیض خلف میں بھی ایسی روحوں کو پیدا کرتا رہا ہے۔ ایک زندہ شہادت تو اس کی یہی ہے۔

بہر حال کہا جاتا ہے کہ حضرت گنگوہی ایک مسلمان حکیم احمد امیر بخش کی مخبری سے رامپور منہیاران میں گرفتار ہو گئے، اور بقول مولانا عاشق الہٰی سہارنپور جیل کے اندر

"تین چار یوم کال کوٹھری، اور پندرہ دن جیل خانہ کی حوالات میں مقید رہے"

سہارنپور سے آپ کو مظفر نگر جیل میں منتقل کر دیا گیا، لکھا ہے کہ

"مظفر نگر کے جیل خانہ میں حضرت کو کم و بیش چھ ماہ رہنے کا اتفاق ہوا"

قرآن مجید کے حفظ کا کام تو فارغ التحصیل ہونے کے بعد ہی پورا کر چکے تھے جیل میں تلاوت ذکر و شغل کے ساتھ ساتھ وعظ و تذکیر کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا، لکھا ہے کہ

"حراست کے زمانہ میں آپ کی نماز ایک وقت کی بھی قضا نہ ہوئی"

نماز صرف قضا ہی نہیں ہوئی، بلکہ

"محبس کی کوٹھری میں بھی نماز با جماعت ادا کرتے رہے" ص۷۳ تذکرۃ الرشید ج ۱

سیرت و کردار اور تقویٰ کی زندگی کا اثر جیل خانہ میں بھی یہ ہوا کہ قیدیوں میں

"بہتیرے وہیں آپ سے بیعت ہوئے"

اس سلسلہ میں ہماری کتاب کے موضوع کے لحاظ سے قابل ذکر اس واقعہ کا اہم ترین جزو وہ ہے جس کا

---

[1] طبقات ابن سعد میں نقل کیا ہے کہ ابراہیم نخعی کی گرفتاری کا حکم حجاج مشہور ظالم امیر نے دیا، وہ روپوش تھے انکو نہیں ایک دوسرے عالم و واعظ ابراہیم تیمی بھی تھے۔ حجاج کے آدمیوں نے ابراہیم نخعی کے اشتباہ میں ابراہیم تیمی کو گرفتار کر کے حجاج کے دربار میں پہنچا دیا، حجاج نے جیلخانہ ہی میں ان کو بجھوا دیا، ابراہیم تیمی جانتے تھے کہ میں دھوکے سے بجائے ابراہیم نخعی کے پکڑا گیا ہوں۔ لیکن اس حقیقت کو آخر وقت تک ظاہر ہونے نہ دیا۔ تا اینکہ جیل ہی میں وفات بھی ہو گئی۔

تو کہاں عزیز مرحوم کا شعر با دنیٰ تصرف یہاں یاد آرہا ہے۔

ملتے ہی آنکھ رنج نہ تھا ظلم غیر کا
رنگ
کیا جانے اس نگاہ نے سمجھا دیا مجھے

آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک نے دوسرے سے کچھ کہا، جانے والا بظاہر جیل میں داخل ہونے کے لئے مغرب کی طرف روانہ ہوگیا اور دیکھنے والا، جب تک دیکھ سکتا تھا، دیکھتا رہا۔ پھران ہی آنکھوں پر کیا گذری ہوگی جو دیکھنے سے بھی محروم کردی گئیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان دونوں صاحبین کے شیخ نے تو خیر مکہ معظمہ ہی کو وطن بنالیا، اور یہی ان کے لئے مقدر بھی تھا، پیدا ہوئے تھے ہند میں، لیکن قدرت ان کو شیخ العجم والعرب بنانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ جس فیصلہ کی تکمیل اسلام کے قبلہ اور مرکز میں قیام کے بغیر ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ باقی صاحبین تو دیکھ چکے کہ معافی عام کے اعلان کے بعد بھی دونوں پر حکومت کی نگرانی قائم رہی، حضرت گنگوہیؒ پر تو مقدمہ بھی چلا۔ جو خطرہ ان کے لئے تھا۔ وہ معمولی نہ تھا، تذکرۃ الرشید میں مولوی عاشق الٰہی نے ایک واقعہ کا تذکرہ کیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اور تو اور ان کے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ تک کو احساس تھا کہ حکومت حضرت گنگوہیؒ کو پھانسی دے دے گی، ایک دفعہ اپنے رفقار سے فرمایا بھی کہ

"میاں کچھ سنا مولوی رشید احمد کو پھانسی کا حکم ہو گیا"۔ [۸۵]

اور جب پھانسی تک کی سزا کا اندیشہ حضرت گنگوہیؒ کے متعلق پیدا ہو چکا تھا، اور اس قسم کی خبریں اڑنے لگی تھیں، تو پھر جس نے شاملی کے دروازے کو جلایا تھا، جس کے جل جانے کی وجہ سے خدا ہی جانتا ہے کہ حکومت کی فوج کے کتنے آدمی مارے گئے۔ جنیو کا ہاتھ چلا کر عفریت پیکر فوجی کو جس نے دوپارہ کیا تھا۔ اس کے سوا خود اس کی تلوار نے کتنوں کو ٹھکانے لگایا تھا، زخم چشم کی عینی شہادت سے جس کا جرم پہچانا بھی جا سکتا تھا اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ وہ خطرات کی کتنی گہری تاریکیوں میں گھرا ہوا ہوگا، جو کچھ بھی سوچا جا سکتا ہے۔ سمجھنا چاہیے کہ سب ہی کی گنجائش تھی۔ لیکن حضرت

گنگوہی پر مقدمہ چلنے، اور جیل میں رہنے کے باوجود اور بقول مولنا عاشق الٰہی سہارنپوری بھی،

"تحقیقات پر تحقیقات اور پیشی پر پیشی ہوتی رہی"۔ ص۸۲

اور مظفرنگر میں بھی حاکم کے سامنے بار بار پیش ہونے پر جس کا حال یہ رہا ہو، کہ

"جو کچھ وہ دریافت کرتا، بے تکلف اس کا جواب دیتے تھے، کبھی کوئی کلمہ دبا کر زبان کو موڑ کر نہیں کہا، کسی وقت جان بچانے کے لئے تقیہ نہیں کیا، جو بات کہی سچ کہی"۔ ص۸۲

بایں ہمہ پھانسی تک کا خطرہ کیا بلکہ گونہ یقین تک کی کیفیت جس کے متعلق پیدا ہو چکی تھی، دیکھا گیا کہ حاکم اس سے پوچھتا ہے کہ

"رشید احمد تم نے مفسدوں کا ساتھ دیا، اور فساد کیا؟"

جواب میں صرف چند الفاظ

"ہمارا کام فساد کا نہیں، نہ ہم مفسدوں کے ساتھی"۔

اور کچھ نہیں کہا گیا، پوچھا گیا

"تم نے سرکار کے مقابلہ میں ہتھیار اٹھائے؟"

بجائے زبان کے دیکھنے والوں نے دیکھا کہ پہلے ہاتھ اٹھا، جس میں تسبیح تھی، اسی تسبیح کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جارہا تھا

"ہمارا ہتھیار تو یہ ہے"۔

"ہاتھ کا یار" یا ہاتھ کی یاری جس سے تھی، اسی کو دکھا دیا گیا، گویا ہاتھ کے اشارے سے حافظ کی غزل سنائی جارہی تھی

گرچہ ما بندگان بادشہیم — بادشاہان ملک صبحگہیم

گنج در آستین و کیسہ تہی — جام گیتی نما، و خاک رہیم

اور یہ کہ ع

روی ہمت بہر کجا کہ نہیم

دشمنان را ز خون کفن سازیم — دوستاں را قبائے فتح دہیم

کہ مصنوعی بندر بھبکیوں کے بعد دیکھا گیا، روایت متواتر ہے، مصدق بالمشاہدہ ہے کہ "پھانسی کے حکم کا انتظار جس کے لئے کیا جارہا تھا" اسی کے متعلق فیصلہ سنانے والا فیصلہ یہ سنا رہا تھا، یا اس سے سنوایا جارہا تھا، کہ

"رشید احمد رہا کئے گئے" ۔ ص۸۵

اور یہاں تو خیر گرفتاری بھی ہوئی، مقدمہ بھی چلا، پیشی بھی ہوئی۔ پوچھ تاچھ سے بھی کام لیا گیا، لیکن جس کا جرم بھی سخت تھا، اور اپنے جرم کی عینی شہادت جس کی پیشانی پر چمک رہی تھی، اپنے تمام ممکنہ وسائل کے ساتھ حکومت کی لامحدود آنکھیں اسے ڈھونڈھتی رہیں لیکن ان ہی آنکھوں کے نیچے چلتا پھرتا رہا، ان ہی کے درمیان سے گذرتا ہوا، پنجاب پہنچا، پنجاب سے سندھ، سندھ سے عرب تک سمندر پھلانگ کر پہنچ گیا۔ وہاں سے واپس بھی لوٹا، دیکھنے والے دیکھتے بھی رہے، لیکن وہ کسی کو نہ سوجھا، اور آج تک یہ معمہ بدرجہ اسباب معمہ ہی بنا رہا کہ ڈھونڈھنے والوں کی انتظار بند میں بکھری ہوئی نگاہیں اچانک کیوں سمٹ گئیں۔ جو مجرم اور سخت مجرم تھا، وہ جرم سے بری کیوں ٹھہرا دیا گیا۔ کم از کم میری جستجو اور تلاش کے لئے تو یہ سوال ابتدا ہی میں بھی چیستان ہی تھا، اور سب کچھ الٹنے پلٹنے اور اسباب کے سارے دفاتر ممکنہ کے کھنگال ڈالنے کے بعد بھی، اب تک وہ چیستان ہی بنا ہوا ہے۔

لیکن میں جانتا ہوں کہ ایسے معموں کا حل ان نمائشی اسباب و مسببات کے پرپیچ سلسلوں میں تلاش کرنا ہے بھی نادانی۔ ایسے حیرت ناک امور اور ان کے حیرت افزا نتائج کا حل صرف ان غیبی میدانوں میں دستیاب ہو سکتا ہے جن کی سرحد عالم محسوسات کے ماوراء سے شروع ہوتی ہے۔ یقیناً وہ مختوم القلوب انہیں کبھی نہیں بجھ سکتے جو ہمہ وقت محسوسات ہی کے دائروں میں تہ و بالا اور غلطان و پیچان ہوتے ہوئے بالآخر ایک دن اسی نا سمجھی کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں۔ کیا انہیں یہ نہیں معلوم کہ ع ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں

اس چیستان کا حل کہ حکومت کی نگاہوں میں ایک سخت ترین مجرم اس کی ساری کوششوں کے

پوچھنے والے پوچھ رہے ہیں، کہ کیا ہوا؟ اور وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ کچھ نہیں ہوا، کچھ نہیں ہوا رُو در رُو ہو کر اس کے چہرے پر گولی چلائی گئی، بندوق کی گولی چلائی گئی، مونچھ اور داڑھی کا بھی کچھ حصہ جل گیا۔ آنکھوں کو بھی چشم زخم پہنچا، لیکن جو آگے بڑھنے ہی کے لئے میدان میں اترا تھا، کچھ اسی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا، جدھر جانے کا وہ فیصلہ کر چکا تھا، طوفان کا رخ پھیرا جائے گا، جو اندھیرا پھیلا ہے، اس کو روشنی سے بدلا جائے گا، اس کا یہ عزم صمیم اب بھی تر و تازہ تھا، اس کی اُمنگوں کا جوش اب بھی باقی تھا، بلکہ شاید کچھ زیادہ تیز، زیادہ قوی ہو گیا تھا، ۵۷ء تک تو اس کے ہاتھ میں تلوار بھی تھی، اس ہنگامہ کے فرو ہو جانے کے بعد تو یہ تلوار بھی چھن گئی، اور غالب ہی کے الفاظ میں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

آہنی اور نقرئی و طلائی الغرض سارے ہتھیار جن سے کام لیا جاتا ہے، وہ سب ہی سے نہتا ہو چکا تھا لیکن اس کے ارادے کی بلندیاں اب بھی باقی تھیں، حالانکہ وقت تنگ ہو چکا تھا، لیکن اسی تنگ وقت میں اس سے جو کچھ ہو سکا کر گذرا، اس کی بھی کوشش بار آور اور سعی مشکور ہوئی، یوں اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک مستقل دینی و علمی تحریک کی بنیاد پڑ گئی۔ یہ وہی دینی و علمی تحریک ہے، جو ضلع سہارنپور کے قصبہ دیوبند کی طرف منسوب ہو کر "دیوبندیت" کے نام سے عوام و خواص میں موسوم و مشہور ہوئی۔

یہ دینی و علمی تحریک جس کا عرفی نام "دیوبندیت" ہے، اور اپنے بانی[۱] کے نام کی نسبت سے اس کی تعبیر چاہئے تو یہی کہ

"قاسمیت"

سے کی جائے۔ حقیقت کی آئینہ دار سچ پوچھئے تو یہی تعبیر ہو سکتی ہے۔

[۱] مراد حضرت نانوتوی قدس سرہ ہیں ۱۲

ستون تو یقیناً گر جاتا، آئندہ اوراق میں ان ہی باتوں کی تفصیل اپنے اپنے مقام پر آپ کے سامنے آئیگی۔

الغرض نام کے لحاظ سے تو میں نہیں کہتا، لیکن کام جو انجام پایا، اسکو دیکھتے ہوئے بلا خوفِ تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ تعلیمی و تدریسی تحریک کے ساتھ ساتھ دیوبندیت ایک قسم کی معاشرتی تحریک بھی ہے، اور سیاسی بھی، دینی ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے پس ماندہ طبقات کی دنیاوی فلاح و صلاح میں بھی اس کا کافی حصہ ہے، اور بوالعجبی یہ ہے کہ گوناگوں پہلوؤں والی اس تحریک کا سرچشمہ نہ تو باضابطہ کوئی سوسائٹی تھی، نہ انجمن، بلکہ سیدنا الامام الکبیر اپنے چند راستباز مخلص رفقاء کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ ہوئے، پھر جس کے ہاتھ میں ہر کام کی آخری باگ ہے وہ اس کو آگے بڑھاتا چلا گیا، واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون۔

بتا چکا ہوں کہ ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۱ء ہجری میں سیدنا الامام الکبیر سفر حجاز سے واپس ہوئے، اور ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۷۹ء ہجری میں کل (۴۹) سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہو گیا، گویا ۵۷ء کے فتنہ کے بعد اٹھارہ سال سے زیادہ وقفہ آپ کو خاکدان ارضی پر قیام کا نہیں ملا۔ اٹھارہ سال کے اس وقفہ میں بھی جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔ یک سوئی کے ساتھ آپ کی سرگرمی اور مشغولیت کی مدت کم و بیش ایک عشرہ یا دس گیارہ سال کے قریب قریب ہے، لیکن اسی مختصر زمانہ میں اس ہمہ گیر تحریک کی صرف بنیاد ہی قائم نہیں ہوئی، بلکہ ہر جہتی حیثیت سے وہ اپنے تمام شعبوں میں ترقی کے خاص حدود تک آپ کی زندگی ہی میں پہنچ چکی تھی۔

حیرت اس پر ہوتی ہے، کہ ان ہی چند گنے چنے سالوں میں ہندوستان کے ایک بدبختانہ شقاقی و افتراقی سیلاب کے مقابلہ میں بھی آپ کو سینہ سپر ہونا پڑا، یعنی مناظرے کے نام سے مشاتمہ و مسابہ کا جو بازار سیاسی بازیگروں کی اندرونی دسیسہ کاریوں کی بدولت اس ملک میں گرم ہوا تھا۔ اور پادریوں کے بعد یا ان کے ساتھ ساتھ ایک نیا محاذ پنڈت دیانند سرسوتی جی نے کھول دیا تھا۔ جیسا کہ آئندہ بتفصیل معلوم ہوگا، اپنی افتادِ طبع کے برخلاف واقعات و حالات نے اس محاذ پر بھی آپ کو لا کر کھڑا کر دیا، کھڑے ہونے کے بعد دیکھنے والوں نے جو کچھ دیکھا تھا، اس کی یاد دلوں سے اس وقت تک محو نہیں ہوئی ہے، اور یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ آپ کی ساری تصنیفی یادگاریں

دیوبند کی اس اسلامی درسگاہ کی ابتدا کب ہوئی، اسی کا جواب دیتے ہوئے ہمارے مخدوم و محترم فاضل گرامی قدر مولٰنا سید محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ العلماء اپنی مشہور و مقبول کتاب "علماء ہند کا شاندار ماضی" میں یہ ارقام فرمانے کے بعد کہ

"۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء تقریباً یوم پنجشنبہ، اسلامی ہند کی تاریخ کا وہ مبارک دن ہے"۔

آگے "انار و محمود" والی حکایت لذیذ کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ

"تاریخ مذکور پر چند باخدا بزرگوں کا اجتماع ہوا۔ چندہ جمع کیا گیا، اور مسجد چھتہ کے فرش پر

درخت انار

کی ٹہنیوں کے سائے میں ایک مدرسہ کا افتتاح ہوا"۔

"درخت انار کی ٹہنیوں کے سائے" کے بعد یہ خبر دیتے ہوئے کہ

"چندہ کا رومال پھیلانے والا، اور سب سے پہلے چندہ دینے والا عابد تھا"۔

یہ "عابد" کس ذات گرامی کی تعبیر ہے۔ اس کی تفصیل آگے معلوم ہوگی، اس وقت تو "حکایت لذیذ" کے اس دوسرے جزء "لفظ محمود" کا تذکرہ مقصود ہے، مولٰنا نے اسی جزء کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے

"سب سے پہلا معلّم محمود، اور متعلم بھی محمود" ص ۶۵ حصہ پنجم (علماء ہند کا شاندار ماضی)

(گذشتہ صفحہ سے) ایک نو گرفتار نوعمر طالب علم ہونے کے باوجود خیال آتا ہے، دل میں اس وقت یہی وسوسہ ہوا تھا کہ تقریباً نصف صدی تک انار کے درخت کا باقی رہ جانا کیا عام حالات میں ممکن ہے، کیونکہ اس وقت تک تقریباً (۴۷) سال مدرسہ کے قیام پر گذر چکے تھے۔ نصف صدی کے لئے کل تین سال کی ضرورت تھی، واللہ اعلم یہ وہی تاریخی درخت تھا، یا کوئی نیا درخت اس کی جگہ لگا دیا گیا تھا، جسے طلبہ تاریخی درخت فرض کئے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں اب بھی یہ "درخت انار" چھتہ کی مسجد میں موجود ہے یا نہیں۔ جذباتی حیثیت سے جی تو یہی چاہتا ہے کہ کاش! انار کے اس درخت کو محفوظ رکھا جاتا، لیکن بودھ کے مقدس درخت کے انجام کو دیکھ کر اب سمجھ میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیعت رضوان والے درخت کو کیوں کٹوا دیا تھا۔ ۱۲

(نوٹ) یہ درخت انار بجنسہٖ وہی ہے جس کا ذکر اس روایت میں کیا گیا ہے اور آج تک محفوظ ہے۔ (محمد طیب غفرلہٗ)

ہوئے۔ تو یقیناً ان کی یہ واپسی یاس اور نامرادی کی واپسی نہ تھی، اور نہ ہو سکتی تھی۔ ایمان و سکینت، ایقان و طمانیت کی جن لاہوتی خنکیوں سے خود انکا اور انکے ساتھیوں کے سینے اور دل لب ریز و معمور تھے، ان لاہوتی خنکیوں کے ساتھ بھلا تنوط و یاس کے غیر ایمانی جذبات کا کوئی تصور بھی کر سکتا ہے، واپس تو وہ بیشک ہوئے تھے، لیکن یقیناً یہ واپسی

جنگ ہی کے لئے کتراتے ہوئے، یا کسی ٹولی کر ملنے کے لئے	متحرفا القتال او متحیزا الی فئة (الانفال)

... ہو سکتی تھی، یقیناً اسی کے لئے تھی بھی، جس کی تصدیق آپ کے آئندہ اقدامات اور دفاعی مجاہدات سے ہوتی ہے۔

۱۸۵۷ء کی کش مکش کی ناکامی کے بعد قتال اور آویزش کے نئے محاذوں اور میدانوں کی تیاری میں آپ کا دماغ مصروف ہو گیا۔ دار العلوم دیوبند کا تعلیمی نظام، اسی لائحۂ عمل کا سب سے زیادہ نمایاں اور مرکزی وجوہری عنصر تھا، وہ مشہور روایت یعنی شاملی کے میدان کے امیر جہاد سیدنا حاجی امداد اللہ المہاجر المکی رحمۃ اللہ علیہ سے اس زمانہ میں جب آپ مکہ معظمہ پہنچ چکے تھے۔ اور ہندوستان میں دار العلوم دیوبند کا افتتاح ہو چکا تھا، عرض کرنے والے نے جب یہ عرض کیا کہ

"ہم نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے۔ اسکے لئے دعا فرمائی جائے۔"

بیان کیا جاتا ہے کہ سننے کے ساتھ شاملی کے میدان کے امیر جہاد یہ فرماتے ہوئے کہ

"سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں، ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے۔"

اس اطلاع سے سرفراز فرمایا تھا کہ

"یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں، اوقات سحر میں سربسجود ہو کر گڑگڑاتی رہیں، کہ خداوندا! ہندوستان میں بقاء اسلام اور تحفظ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر۔"

اور اسکے بعد اصل واقعہ کا اظہار حاجی صاحب نے ان الفاظ میں فرمایا کہ

"یہ مدرسہ (یعنی دار العلوم دیوبند) ان ہی سحر گاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔" (ارواح ثلثہ وعلماء ہند کا شاندار ماضی)

پیرومرشد کی قدم بوسی کے حصول برکت وسعادت ہی کی حدتک کیا محدود تھا؟ یا محدود رہ سکتا تھا؟ بظاہر ایسی فاش شکست کے بعد مامور کی اپنے امیر کے ساتھ بار بار کی یہ ملاقاتیں، یقیناً صرف گونگی بہری خشک ملاقاتیں بن کر نہ رہ سکتی تھیں، اور نہ واقع میں ان ملاقاتوں کی یہ نوعیت تھی۔ دعا ہائے سحر گاہی اور نالہ ہائے نیم شبی جنھیں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کسی ایک "پیشانی" کی طرف نہیں، بلکہ "پیشانیوں" کی طرف منسوب کر رہے تھے، ان "پیشانیوں" میں کم ازکم ان دونوں "امیر و مامور" "پیر و مرید" کی "پیشانیوں" کو تو بہر حال شریک ہی تسلیم کرنا پڑے گا۔

سیدنا الامام الکبیر اس کے بعد جیساکہ آپ سن چکے روپوشی کے ایام میں خود حجاز پہنچ جاتے ہیں۔ "امیر اور مامور" کے باہمی اجتماع کی یہ صورت کیا صورت ہی بن کر رہ سکتی تھی، جس کے اندر ہم فرض کرلیں، بلاوجہ فرض کرلیں کہ کوئی "معنے" نہ تھے۔

الغرض واپس ہونے والا جب واپس ہوا تھا تو کسی نئے محاذ ہی کے قائم کرنے اور اس "فئۃ" یا جماعت سے رشتۂ اتصال و ربط کو درست کرنے ہی کے لئے واپس ہوا تھا جس کے اجتماعی شیرازے کو درہم وبرہم کرکے چاہا جارہا تھا کہ ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کردیا جائے، جس کتاب کو اس نے خدا کی کتاب مانا تھا، اور اس کے احکام کو خدا کا حکم یقین کرتا تھا، اس کا مطالبہ بھی یہی تھا، اور جن لوگوں کے ساتھ وہ واپس ہوا تھا، ان کے بڑوں اور چھوٹوں کے متعلق بھی ہم اس کے سوا اور کچھ نہیں سوچ سکتے کہ اس قرآنی مطالبہ کی تعمیل و تکمیل ہی کے لئے وہ واپس ہوئے تھے۔ خود اس کے بلند عزائم، اور وسیع حوصلوں کا اقتضا بھی یہی تھا۔

پس واقعہ یہی ہے کہ دیکھنے والوں نے ۵۷ء کے ہنگامہ رست و خیز کے دھیمے پڑجانے کے بعد اس کو جو کچھ کرتے ہوئے دیکھا، بذات خود اس کے لئے اور واپس ہونے والے ساتھیوں کے لئے یہ سب کچھ دیکھا بھالا تھا، ایک طے شدہ "لائحہ عمل" تھا۔ اپنے اپنے وقت پر اسی کے فیصلے عملی قالب اختیار کرتے چلے جاتے تھے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ مصلحت الٰہیہ اور "اجل مسمیٰ" کا اٹل قانون ہندی مسلمانوں کے اندر اس کے قیام کی مدت کو اگر حد سے زیادہ مختصر نہ کردیتا، تو

اسپرٹ موجود تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ اساسی خصوصیت حضرت والا کے سوا کسی کے سامنے نہ تھی، اور نہ ہی ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو اس وقت سامنے تھے، ہر ایک سے اتنی بلند نظری کی توقع ہی کی جاسکتی تھی۔ چنانچہ سیدنا الامام الکبیر کی مجلس انس کے سب سے پہلے اور اہم رکن حاجی سید محمد عابد صاحب تھے جن کی بزرگی ہی کا نہیں دانشمندی اور اصابت رائے کا بھی اس زمانہ میں خاص شہرہ تھا۔ جیسا کہ آگے آرہا ہے لیکن وہ بھی باوجودیکہ اجراء مدرسہ میں سیدنا الامام الکبیر کے دست راست ثابت ہوئے مگر اس تصور سے خالی تھے۔ مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ العلماء ہند نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ

"اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ دارالعلوم کے پرشوکت تصور سے حضرت حاجی صاحب (حاجی محمد عابد صاحب) کا ذہن خالی تھا۔[1] (علماء ہند کا شاندار ماضی)[2]

کسی موقع پر الاستاذ الاکبر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے خود سنا ہوا فقرہ اس کتاب میں نقل کرچکا ہوں جو ارواح ثلثہ میں بھی منقول ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی موجودہ پرشکوہ عمارتوں کے متعلق حضرت ممدوح

---

[1] دیکھو سوانح قاسمی جلد اول ص۱۹۹ ۱۲

[2] مولانا محمد میاں صاحب نے اس دعوے کی دلیل میں جو واقعہ شاندار ماضی میں پیش کیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے جو میں نے اپنے متعدد بزرگوں سے سنی ہے کہ مدرسہ جاری ہوچکا تھا، لیکن اس کی کوئی مستقل عمارت نہ تھی۔ کرایہ کے مکانوں میں تعلیم دی جاتی تھی۔ جب سلسلہ تعلیم بڑھنے لگا اور مکان کی تنگی محسوس ہوئی تو حضرت نانوتوی رح کی رائے یہ ہوئی جس کے مؤید مولانا محمد یعقوب صاحبؒ، حضرت گنگوہیؒ اور حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری بھی تھے، کہ مدرسہ کی کوئی اپنی مستقل جگہ اور عمارت ہونی چاہئے۔ (جیسا کہ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ نے ضمیمہ روداد مدرسہ بابت ۱۲۹۰ھ میں ظاہر فرمایا ہے) حاجی صاحب نے اس کی شدت سے مخالفت فرمائی کہ کیا ضرورت اتنے مصارف کی، مسلمانوں کا پیسہ ضائع ہوگا۔ جامع مسجد کی سہ دریاں اور حجرے اس کے لئے بالکل کافی ہیں۔ لیکن بقول حضرت شیخ الہند رح کے کہ حضرت والا کے سامنے مدرسہ کا روشن مستقبل تھا، اسلئے انہوں نے فرمایا کہ حاجی صاحب مدرسہ کے لئے الگ ہی جگہ مناسب ہے۔ مسجد میں مدرسہ کا ہونا بہت سے اشکالات اور دشواریوں کا باعث ہوگا۔ یہ طلبہ کی قوم آزاد قوم ہوتی ہے۔ کبھی شکایت ہوگی کہ مسجد کے لوٹے ٹوٹ گئے کبھی فریاد ہوگی کہ مسجد کی صفیں گم ہوگئیں۔ لالٹینیں نہ رہیں۔ غرض اس قسم کی بیسیوں مشکلات پیش آئینگی۔ اس لئے مدرسہ کا مسجد سے الگ اپنے ہی (باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

نے فرمایا کہ

"حاجی صاحب (حاجی محمد عابد صاحبؒ) کے سامنے دارالعلوم کا وہ مستقبل نہ تھا جو حضرت استاذ (حضرت نانوتویؒ)
کو نظر آرہا تھا۔ انکی فراست کے سامنے یہ مکتب مدرسہ اور پھر مدرسہ سے دارالعلوم ہونے والا تھا"

بہرحال مدرسہ کے اجراء و قیام کی حد تک وہ اپنے اور اپنے رفقار کار کے اسی طے شدہ "لائحہ عمل" کے ساتھ نئے محاذ
کے کھولنے کیلئے صرف صالح اور قابل زمین کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ دینی تعلیم کا اجتماعی نظام جس میں عصری

(گذشتہ صفحہ سے) مکان میں رہنا مناسب ہے۔ مگر حاجی صاحب نے اس رائے کو تسلیم نہ کیا۔ آخر کار حضرت والا نے
لوگوں سے فرمایا کہ مکان مدرسہ کیلئے اشتہار جاری کر دیا جائے۔ اس اشتہار میں اس کا تذکرہ نہ ہو کہ مدرسہ کا مکان الگ بنے گا یا مسجد
میں رہے گا۔ یہ وقت پر طے ہوتا رہیگا۔ اتنے عرصہ میں حاجی صاحب بھی انشاء اللہ موافقت فرمالیں گے۔ چنانچہ اشتہار جاری ہو گیا اور
اس میں عام مسلمانوں کو دعوت دی گئی۔ جمعہ کا دن سنگ بنیاد رکھنے کا طے ہوا اور پروگرام یہ تھا کہ بعد نماز جمعہ حضرت والا وعظ
فرمائیں گے اور ختم وعظ پر یہ سارا مجمع شہری اور بیرونی حضرات کا جائے مقررہ پر پہنچکر سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب میں شرکت کریگا
چار آنہ گز کے حساب سے زمین کا معاملہ طے ہو چکا تھا۔ چنانچہ حسب پروگرام عمل ہوا۔ اطراف واکناف کے لوگ جمع
ہوئے، اور حضرت کے وعظ کی وجہ سے لوگوں کا ہجوم اور بھی زیادہ تھا۔ وعظ ہوا، اور ختم وعظ پر حضرت نے فرمایا کہ جائے
بنیاد پر سب حضرات چلیں تاکہ سنگ بنیاد رکھدیا جائے۔ یہ سنتے ہی حضرت حاجی صاحب نے غصہ کی آواز میں زور
سے فرمایا، ہائیں؟ یہ کیا؟ حضرت نے فرمایا کہ حاجی صاحب یوں ہی مناسب ہے۔ آپ تشریف تو لے چلیں
فرمایا، کیوں چلوں! کیا ضرورت ہے اس اسراف کی؟ اور کیوں یہ بیکار اتنا بڑا بار اٹھایا جا رہا ہے؟ یہ الفاظ حضرت
حاجی صاحب نے غصہ سے بھرائی ہوئی آواز میں فرمائے۔ حضرت نے فرمایا حاجی صاحب آپ وہ چیز نہیں دیکھ رہے
ہیں جو مجھے نظر آرہی ہے۔ یہ مدرسہ بڑھنے والی چیز ہے۔ اس پر حاجی صاحب نے پھر زور سے انکار ہی میں جواب
دیا۔ حضرت نے فرمایا حاجی صاحب کو اختیار ہے۔ سب صاحب چلیں اور سنگ بنیاد رکھیں۔ حاجی صاحب تو
جامع مسجد سے روانہ ہو کر چھتہ کی مسجد میں اپنے حجرہ میں جا بیٹھے اور یہ مجمع اور ہجوم حضرت کے ساتھ مدرسہ کی طرف
روانہ ہوا۔ جب اس جگہ پہنچے جہاں سڑک پر مدرسہ کا موجودہ بڑا دروازہ ہے۔ مجمع کو روک کر حضرت والا نے فرمایا کہ
آپ لوگ یہاں ٹھہریں۔ میں ابھی حاضر ہوا اور سیدھے چھتہ کی مسجد میں پہنچے اور حاجی صاحب کے حجرہ میں پہنچکر فرمایا۔ اجی
حاجی صاحب آپ تو ہمارے بڑے اور بزرگ ہیں، اور ہم سب آپ کے چھوٹے ہیں۔ بھلا ہم آپکو یا آپ ہمیں چھوڑ سکتے ہیں،
اور یہ کہہ کر حاجی صاحب کے پیروں پر ہاتھ رکھدیئے۔ اس طرز عمل کا حاجی صاحب پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ بے اختیار رو پڑے اور اتنا کہ
آواز نکل گئی۔ انتہائی کسر نفسی سے فرمایا مولانا میرا قصور معاف فرما دیجئے۔ بات وہی حق ہے جو آپ فرما رہے ہیں۔ حضرت نے حاجی صاحب
کو اٹھا کر گلے لگایا، اور لیکر جائے بنیاد پہنچے۔ مجمع ان دونوں بزرگوں کو آتے ہوئے دیکھ کر بے حد مسرور ہوا۔ سارے مجمع میں خوشی کی
ایک لہر دوڑ گئی، اور پھر سب نے ملکر درسگاہ نودرہ کی بنیاد رکھی جو دارالعلوم کی سب سے پہلی عمارت ہے۔

محمد طیب غفرلہ

دل کے لحاظ سے "الہامات" اور دماغ کے اعتبار سے چاہیئے تو "عمل کے لائحات" سے بھی اس کی تعبیر کر سکتے ہیں۔ عرض ہی کر چکا ہوں کہ قیادت و امامت کی راہ نمائیوں میں بھی جوہری فرق ہے۔

اور یہی میرا مطلب بھی ہے، کہ "نئے محاذ" کا کسی تعلیمی و تدریسی نظام کے تحت کھولنے کا ارادہ تو فیصل شدہ ارادہ اور الہامی محرکات کے زیر اثر قطعی فیصلہ کی صورت اختیار کر چکا تھا، اور بقول حضرت حاجی صاحبؒ دیوبند کی سرزمین کی یہ قسمت تھی کہ قدرت کی طرف سے اسی کا انتخاب سب سے پہلی دفعہ اس نئے محاذ کے افتتاح کے لئے ہوا۔

لیکن ظاہر ہے کہ قسمت کہئے یا ازلی تقدیر کا ظہور ہمیشہ اسباب و علل کے پردوں ہی میں ہوتا ہے دیوبند کی سرزمین کے لئے یقیناً یہ ایک تقدیری فیصلہ تھا، مگر "منصۂ شہود" پر یہی تقدیر تدبیر کے کس رنگ میں جلوہ گر ہوئی، اس کی حد سے زیادہ تشنہ اور قطعاً نامکمل تعبیر ہوگی۔ جسے لوگ "انار اور محمود" کی روایت کی حد تک محدود کر دیتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے، عرض ہی کرتا چلا آرہا ہوں، کہ اس نئے محاذ کے بانی سیدنا الامام الکبیرؒ کے دیوبند والوں سے قرابت قریبہ کے موروثی تعلقات پشتہا پشت سے قائم تھے، یہ بھی آپ سن چکے کہ آج جس مقام پر دار العلوم کی طویل و عریض عمارتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے اسی کے قریب دیوان کی ڈیوڑھی میں حضرت والا کی تعلیمی زندگی کا ابتدائی زمانہ گذرا تھا، نہ صرف دیوبند، بلکہ آپ کی طرف سے ۵۷ء کی ناکامی کے بعد "نیا محاذ" دیوبند کے جس قطعۂ اراضی پر کھلنے والا تھا، خاص اسی قطعۂ اراضی اور خطۂ پاک سے بچپن ہی میں مانوس بنانے کا قدرت نظم کر چکی تھی۔ آج جہاں دار العلوم ہے یہی میدان اس کے باغ، تالاب، آپ کی بازیگاہ اور سیر گاہ تھی، پھر دیوبند کے دیوان کی یہی ڈیوڑھی آپ کی سسرال بھی بنی، اور جیسا کہ بہ تفصیل بتایا جا چکا ہے، ۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد سیدنا الامام الکبیرؒ کی روپوشی کی کافی مدت دیوبند ہی میں گذری، حالات ہی ایسے تھے کہ نانوتہ سے اپنے اہل و عیال کو اس زمانہ میں دیوبند ہی منتقل کرنا پڑا، بلکہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے جو یہ خبر دی ہے، جس کا پہلے بھی ذکر کر چکا

یوں کہ سیدنا الامام الکبیر نے دیوبند کو بجائے نانوتہ کے جب اپنا وطن ثانی قرار دیا تو

"شمس الاسلام کی رونق افروزی ہوئی"

ان ہی الفاظ کو بعض لوگوں نے آپ کی اس نئی توطن پذیری کا مادہ تاریخ قرار دیا تھا، جس کے اعداد

بھی ۱۲۸۵ھ ہیں جو عیسوی سن کے حساب سے ٹھیک وہی ۱۸۶۷ء کا سال ہے، جس کے معنے

یہی ہوئے کہ ۱۲۸۵ھ ہی میں یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ بجائے نانوتہ کے حضرت والا کے اہل و عیال کا مستقل

قیام دیوبند ہی میں رہے گا۔ اور ہوا بھی یہی کہ دیوبند کی زندگی کے زمانہ کا بڑا حصہ حضرت الاکادیوان کی ڈیوڑھی

کی مغربی پشت پر چھتہ کے نام سے جو ایک مسجد تھی، اور اس وقت تک بحمد اللہ موجود ہے اس میں گذرا۔ زمانہ دراز

سے اس مسجد کے حجرے صاحب دل بزرگوں کی قیام گاہ بننے کی سعادت حاصل کرتے چلے آتے

تھے۔ اور اس زمانہ میں بھی دیوبند کے دو مشہور و معروف بزرگوں یعنی حاجی سید محمد عابد حسین صاحب

اور مولانا رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہما کی قیام گاہ بھی چھتہ کی مسجد کے یہی حجرے تھے، ہم جنسی اور ہم مذاقی

کے رشتہ کا اقتضاء ہوا کہ اس زمانہ میں "خلوت گاہِ حق" بننے کا شرف چھتہ کی مسجد کے ایک حجرے کو

سیدنا الامام الکبیر کے قیام کی وجہ سے حاصل ہوا[1]۔

چنانچہ صاحب سوانح مخطوطہ نے یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ

"اسی زمانہ میں جناب مولوی رفیع الدین صاحب و جناب حاجی محمد عابد صاحب دیوبندی

جن کی تعریف ذیل میں مفصل درج کی جاوے گی، چھتہ کی مسجد میں قیام پذیر تھے"

آگے اطلاع دی ہے کہ

"مولانا سیدنا الامام الکبیر نے ان بزرگوں کی وجہ سے اسی مسجد میں قیام کیا، اور ان دونوں

[1] ہمارے مخدوم و محترم الحاج مولوی سید محی الدین صاحب بی۔ اے (علیگ) وبیر اسٹرایٹ لا، جو حکومت آصفیہ حیدرآباد دکن میں ایگزیکٹو اور مجلس تعلیم و مذہب کے محکمہ کی معتمدی (سکریٹری) کے عہدہ سے وظیفہ یاب ہو کر اب کلفٹ ... کے "ایک ستاقی" بنے ہوئے کراچی میں مقیم ہیں، ان کی یہ خوش قسمتی تھی کہ چھتہ کی مسجد کے اس حجرے کی ... حالی کو دیکھ کر اپنے ذاتی مصارف سے اتنا درست کرا دیا کہ گویا ایک نیا کمرہ ہی بن گیا، جس سے طلبہ مستفید ہوتے ہیں اور سید صاحب کے حق میں دعا گو ہیں ۱۲

اس وقت یہ بزرگ پنشن لے کر دیوبند آچکے تھے، اور خانہ نشین ہو گئے تھے۔
شاید اسی لئے سوانح مخطوطہ کے مصنف کے کلام میں سیدنا الامام الکبیر کے عہد رونق افروزی وقیام دیوبند کے بارہ میں جو "عہد قدیم" کا لفظ پایا جاتا ہے اور اس قید "عہد قدیم" کے ساتھ جن خواص مجلس کے ناموں کا ذکر انہوں نے کیا ہے ان میں ان دونوں بزرگوں کا ذکر نہیں ملتا، سوانح مخطوطہ کے الفاظ یہ ہیں۔

"اس عہد قدیم" (زمانہ ورود حضرت نانوتوی رح یعنی ۱۲۸۳ھ) کے مجمع کے خاص لوگ یہ ہیں۔ حاجی دیوان محمد یٰسین صاحب عرف اللہ دیا، حافظ انوار الحق صاحب عرف حافظ کلو، پیرجی ماجد علی صاحب، حاجی ظہور الدین صاحب، حکیم مشتاق احمد صاحب (ایک جگہ ذیل کے دو نام اور اضافہ کئے ہیں) شیخ منظور احمد صاحب، منشی نہال احمد صاحب"۔

گویا اس مجلس انس کی ابتدا چھتہ کی مسجد میں حاجی محمد عابد صاحب اور مولانا رفیع الدین صاحب کی رفاقت سے ہوئی اور رفتہ رفتہ اس میں دیوبند کے مختلف محلوں کے برگزیدہ اور سربرآوردہ لوگ شامل ہوتے گئے، جن سے "عہد قدیم" کی مجلس کی قدرتی تشکیل ہوئی، اور قصبہ کی اصلاح اور نئے محاذ کی زمین ہموار کرنے میں اولاً یہی حضرات سیدنا الامام الکبیر کے دست وبازو ثابت ہوئے، جن کے احوال پر صاحب سوانح مخطوطہ نے بھی اجمالی روشنی ڈالی ہے۔ "عہد قدیم" کی قید کو سامنے رکھ کر جس کی ساتھ ان مخصوص ناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد والے دور کو جس میں یہ دونوں بزرگ مولٰنا ذوالفقار علی صاحب اور مولانا فضل الرحمن صاحب بھی آملے۔ مسجد چھتہ کی مجلس کا "عہد جدید" کہنا چاہئے۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ "عہد قدیم" نئے محاذ کے لئے تہیۂ استعداد اور زمین ہموار کرنے کا دور تھا اور "عہد جدید" اس کی عملی تشکیلات اور فعلیت کے ظہور کا زمانہ تھا۔

اس "عہد قدیم" میں جیسا کہ ذکر کر چکا ہوں چھتہ کی مسجد کے گوشہ گزینوں میں حاجی سید محمد عابد و مولٰنا رفیع الدین دو ایسے بزرگ تھے، جن کو سیدنا الامام الکبیر کے بساط قرب وانبساط میں علاوہ ظاہری وباطنی فوائد کے جو حضرت والا کی مجالس انس ودانش کی خصوصیات تھیں۔ سب سے زیادہ

قلب پروارد ہوتا ہے وہی بعینہ میرے قلب میں منعکس ہو جاتا ہے اور میں وہ کر گذرتا ہوں۔ چنانچہ پیر سے کر لینے کے بعد حضرت نانوتوی فرماتے کہ مولانا اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے میرے دل میں یہی آرہا تھا جو آپ نے کر لیا۔ فرمایا کہ بارہا نہیں تقریباً میرے تمام کاموں میں حضرت سے ہم آہنگی کی یہی نوعیت قائم رہتی تھی اور حضرت نانوتوی اسی طرح اسے ظاہر فرمایا کرتے تھے۔

رہے ہمارے سید مغفور و مرحوم حاجی سید عابد حسین صاحب، انہوں نے سیدنا الامام الکبیر کے اس "نئے محاذ" کی افتتاحی منزلوں میں جو کارنامے انجام دیئے ہیں، ان سے وابستگان دارالعلوم کے عوام نہ سہی، خواص اچھی طرح واقف ہیں۔ چنانچہ حاجی صاحب ممدوح کی اس جدید پرداز اور "عزلت گیری" کی مخفی روح مولانا فضل الرحمٰن صاحب مرحوم نے عاطف قاسمی ہی کو ٹھیرایا ہے، وہ اپنے ایک مشہور قصیدہ میں ان کے مناقب کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ

مرد حق "عابد" صداقت کیش ۔۔۔ اولین گستر اندر د مالش

ہم با خلاص دل دراں بنہاد ۔۔۔ چیزے از طیبات اموالش

گوئیا ایں ہمہ فتوح کثیر ۔۔۔ در رسیدہ ہمہ با فضالش

آگے اس مخفی روح کا ذکر کر رہے ہیں کہ

لیک ایں "طائر ہمایوں فال"[1] ۔۔۔ شد ز قاسم عطا پرو بالش

یہاں مجھے حاجی صاحب کے متعلق یہ عرض کرنا ہے، کہ باطنی معرفت و سلوک کا جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے حاجی صاحب ممدوح کو نو عمری ہی سے شوق تھا۔ سوانح مخطوطہ کے مصنف کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ چشتی طریقہ کے ایک بزرگ جن کا نام نامی میاں جی کریم بخش تھا، رامپور منیہاران کے رہنے والے تھے۔ ان ہی سے حاجی صاحب مرید ہوئے، کسب و سلوک کے مراتب ان ہی کے زیر تربیت طے کئے۔ خلافت بھی حاجی صاحب کو میاں جی کریم بخش ہی سے شروع میں حاصل ہوئی تھی۔ اسی بنیاد پر لکھا ہے کہ سید صاحب

---

[1] یعنی حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

"جناب میاں جی کریم بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ رام پوری چشتی کے خلیفہ ہیں"۔ صفحہ ۳۶

اسی کتاب میں اس کی معاصرانہ شہادت بھی مصنف کتاب نے ادا کی ہے کہ

"اہل دیوبند کو آپ سے (یعنی سید محمد عابد صاحب سے) کمال درجہ عقیدت ہے"۔

ظاہر ہے کہ ایک سالک مسلک معرفت وحقیقت ہونے کے ساتھ ساتھ جب اپنے پیر ومرشد میاں جی کریم بخش رحمۃ اللہ علیہ چشتی کے خلیفہ مجاز بھی سید صاحب ہو چکے تھے، تو اس زمانہ کے لحاظ سے مسلمانان دیوبند کی عقیدت کیشیوں اور نیازمندیوں کی مرکز ان کی ذات گرامی بن گئی ہو، تو اس کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا تھا، بلکہ اسی کے ساتھ اسی کتاب میں سید صاحب مرحوم کی ایک خصوصیت جس کے گونہ مشاہدہ کا موقعہ خود اس فقیر کو بھی اس زمانہ میں ملا ہے جب دارالعلوم میں زیر تعلیم تھا، نہ صرف دیوبند، بلکہ دیوبند سے باہر حتی کہ صوبجات متحدہ سے بھی آگے بڑھ کر بہار وبنگال تک سید صاحب کی اس امتیازی خصوصیت کا چرچا اور شہرہ پھیلا ہوا تھا، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ سید صاحب کے دیگر ظاہری و باطنی کمالات کے ساتھ ساتھ

"ان میں ادنی تعویذ وگنڈہ ہے، جس کے سبب اہل دیوبند اور نواح دیوبند کے ہر قسم کے دکھ درد دلدر دور ہوتے ہیں"۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ سید حاجی صاحب کی ہر دل عزیزیاں خواص ہی کے حلقہ تک محدود نہ تھیں، بلکہ بقول مصنف کتاب

"دیوبند کے مسلمانوں میں شاید کوئی ایسا بچہ ہوگا جس کے گلے میں آپ کا (یعنی حاجی سید عابد صاحب کا) تعویذ نہ ہوگا، اور کم تر ایسی عورتیں ہوں گی، جن کے بازو پر آپ کا نقش نہ ہو"۔

سید صاحب کے اسی "نقش" کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت حکیم الامت نے مثنوی میں جو دارالعلوم کے متعلق کسی زمانہ میں آپ نے نظم فرمائی تھی، یہ مصرعہ بھی لکھا،

"ع نقش و تعویذش مثال نقش قدر" (منقول از ص۸۵ حصہ پنجم علماء ہند کا شاندار ماضی)

واقعہ یہ ہے کہ جسکی جھاڑ پھونک، تعویذ گنڈوں کی مقبولیت کا حال جب یہ ہو جیسا کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ

"آپ کا مطب (تعویذی) بڑے بڑے (دوائی) طبیبوں سے زیادہ گرم رہتا ہے، خصوصاً وبائی و موسمی امراض میں غرباء علاج کم کرتے ہیں، آپ ہی کے تعویذوں پر قناعت کرتے ہیں"

خواص و عوام کی فیض رسانی کی اس زمانہ میں یہ ایک صورت ایسی تھی کہ مصنف کتاب کو یہ گواہی دینی پڑی کہ

"آپ کی (سید صاحب کی) ذات فیض آیات سے خلائق کو بہت طرح کا نفع حاصل ہے"

"خلائق" کے اس لفظ میں اسی کتاب کے مصنف کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں ہی تک اس باب میں آپ کی فیض رسانیاں محدود نہ تھیں، بلکہ وہی لکھتے کیا اپنی عینی شہادت نقل کرتے ہیں کہ

"غیر مذہب والے بھی آپ کے تعویذوں کے معتقد ہیں"[1]

الغرض ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں حاجی سید محمد عابد صاحب کی ذات بابرکات پر گویا دیوبند اور اس کے باشندے سمٹے ہوئے تھے، جن میں مسلمانوں کے ساتھ جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں غیر مسلم بھی شریک تھے، علاوہ درویشی کے حالات کے شریعت کے ظاہری احکام کی پابندی میں ان کے رسوخ اور استواری کا یہ حال تھا کہ بقول مولانا سید محمد میاں صاحب علماء ہند کے مشہور سر برآوردہ عالم

[1] ارواح ثلاثہ میں حضرت تھانوی کی طرف یہ روایت منسوب کی گئی ہے کہ حاجی سید محمد عابد صاحب کے ساتھ عورتوں کی عقیدت کا یہ رنگ تھا کہ ایک ...سوی صاحب جن کا دوپٹہ چوری گیا تھا، کہتی تھیں کہ کچھ پرواہ نہیں، حاجی محمد عابد سے کہلا بھیجو دوپٹہ یہیں آجائے گا۔ چنانچہ حاجی صاحب سے کہلا بھیجا گیا، انہوں نے تعویذ دے کر فرمایا کہ الگنی جس پر کہ دوپٹہ چوری گیا ہے، اسی پر آجائے گا۔ چنانچہ دوپٹہ وہیں آگیا۔ اسی کتاب میں ہے کہ حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ شاید کوئی جن وغیرہ تابع ہے۔ ص۲۷۰ قصص الاکابر ۱۲

(مناظر مولانا مرتضیٰ حسن مرحوم یہ کیفیت بیان فرماتے تھے، کہ

"ایک روز آپ کو (یعنی حاجی محمد عابد صاحب کو) بہت رنجیدہ دیکھا گیا، کبیدگی اور افسردگی کی یہ حالت تھی، کہ جیسے کسی جواں مرگ .... پر ہو، جب سبب دریافت کیا گیا، تو بہت اصرار کے بعد معلوم ہوا کہ اٹھائیس سال بعد آج جماعت صبح کی تکبیر تحریمہ فوت ہو گئی۔" ص۵۵ ج ۱

اب صحیح طور پر تو میرے لئے یہ بتانا دشوار ہے کہ یہ کس زمانہ کی بات ہے، چھتہ کی مسجد میں سیدنا الامام الکبیر نے جو آتشدان روشن فرمایا تھا، اور بجائے "گلیم بری" کے "غریق گیری" کے ذوق کا شعلہ آپ کی وجہ سے دلوں میں بھڑک اٹھا تھا۔ اس کے بعد کا یہ واقعہ ہے یا پہلے کا، یعنی سوانح مخطوطہ کے مصنف کی روایت ہے کہ حاجی عابد حسین پر ایسا حال طاری ہوا کہ

"گھر، باہر، زمین، باغ، جس قدر آپ کی ملک میں تھا، سب کا سب راہ خدا میں دیکر محض خدا پر تکیہ کیا۔" ص۳۶

گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ دینی تعلیم کے اجتماعی نظام کے قالب میں "نئے محاذ" کے افتتاح کے لئے تعلیم کے اس جدید نظام کے چند عملی تجربہ کاروں کے ساتھ ساتھ کام کو ہاتھ میں لینے، اس کو پروان چڑھانے، آگے بڑھانے کے لئے ایک ایسی

"ہمہ وقتی توانائی"

کا جو اہم سوال تھا، یعنی ہر طرف سے سمٹ سمٹا کر کامل یک سوئی کے ساتھ اسی کا جو ہو کر رہ جائے، اسی سوال کا مجسم زندہ جیتا جاگتا جواب بن کر حاجی محمد عابد کی ذات گرامی نگاہوں کے سامنے دیوبند میں گویا کھڑی ہو گئی تھی،

"دیوبند کی قسمت ہے کہ اس دولت گرانمایہ کو یہ سرزمین لے اڑی۔"

حضرت حاجی امداد اللہ المہاجر المکی رحمۃ اللہ علیہ کے اس اجمالی ارشاد کا یہی تفصیلی مطلب یا قسمت و تقدیر کے ظہور کی یہی تدبیری شکل تھی، زمین بھی مل گئی، زمین پر کام کرنے والے بھی مل گئے، تو جس قالب

میں "نئے محاذ" کے کھولنے کا ارادہ کیا گیا تھا، وہ کھول دیا گیا۔

یہی دار العلوم دیوبند ہے، جو بحمد اللہ اس وقت تک اپنے تاریخی وجود، اور تاثیری نتائج و ثمرات کے ساتھ ہم سب کے سامنے ہے، دیوبند کی خوش قسمت سرزمین میں درخت انار کی چھاؤں کے نیچے محمود معلم و متعلم ناموں کو بٹھا کر کھولنے والوں نے "نئے محاذ" کے اس تعلیمی قالب کے کھولنے کی توفیق جس زمانہ میں توفیق یافتوں کو بخشی گئی تھی کھول دیا، اسی زمانہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمارے مصنف امام نے اپنی کتاب میں یہ خبر سنائی ہے کہ

"وہی زمانہ تھا کہ مدرسہ دیوبند کی بنیاد ڈالی گئی، اور مولوی فضل الرحمن اور مولوی ذوالفقار علی اور حاجی محمد عابد صاحب نے یہ تجویز کی کہ ایک مدرسہ دیوبند میں قائم کریں۔" ۳۹

اس سے پہلے خود ہی یہ اطلاع بھی دی ہے، کہ اس زمانہ میں خود وہ اور سیدنا الامام الکبیر مولانا محمد قاسم نور اللہ ضریحہما بھی میرٹھ میں مقیم تھے، اور مطبع مجتبائی جو پہلے میرٹھ ہی میں قائم ہوا تھا، اسی مطبع میں چھپنے والی کتابوں کی تصحیح کی خدمت دونوں حضرات انجام دیتے تھے، بطور خود میرٹھ میں انفرادی درس و تدریس کا سلسلہ بھی سیدنا الامام الکبیر نے جاری کر رکھا تھا، جس زمانہ میں قصبہ دیوبند میں مدرسہ کی بنیاد پڑی، پڑھنے والے آپ سے صحیح مسلم پڑھ رہے تھے۔[1] پڑھنے والوں میں خود ہمارے مصنف امام بھی شریک تھے۔

---

[1] ایک بات یاد آ گئی، بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیری (جن کا آبائی وطن دیوبند ہی کے قریب ضلع مظفر نگر کے ایک گاؤں محی الدین پور نامی متصل اسٹیشن کھاتولی ہے) اس زمانہ میں جب حضرت والا مونگیر کی خانقاہ رحمانیہ میں جلوہ افروز تھے۔ براہ راست اس قصہ کو فقیر سے بیان کیا کرتے تھے کہ طالب علمی کے زمانہ میں مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے درس حدیث میں شریک ہونے کی سعادت مجھے بمقام میرٹھ میسر آئی تھی۔ غالباً یہ وہی زمانہ تھا جب صحیح مسلم کا درس جاری تھا، مولانا مونگیری قدس سرہ العزیز فرماتے تھے، حدیث پڑھی گئی، حنفیوں اور شافعیوں کے کسی اختلافی مسئلہ سے حدیث کا تعلق تھا، میں نے دیکھا کہ مولانا نے ایک ایسی جامع و مدلل تقریر کی جس سے کلیۃً شافعی نقطۂ نظر کی تائید ہوتی تھی، طلبہ حیران ہوئے کہنے لگے کہ آپ کی اس تقریر سے تو معلوم ہوا کہ امام شافعی ہی کا مسلک صحیح ہے، اور حنفیوں کا مذہب حدیث کے مطابق نہیں ہے۔ مولانا مونگیری فرماتے تھے۔ تب میں نے دیکھا کہ مولانا نانوتوی نے رنگ بدلا، اور فرمانے لگے کہ شوافع کی طرف سے اس مسئلہ کی تائید میں زیادہ سے زیادہ (باقی اگلے صفحہ پر)

لانے والوں کا یہ سیاسی نکتہ ہے کہ اپنے خاص حالات کے لحاظ سے قصداً وارادۃً سیدنا الامام الکبیر نے اپنے آپ کو اس مقام سے غائب کر دیا تھا۔ جہاں بہرحال ان کی حاضری عقلاً ضروری اور ناگزیر تھی۔ یعنی اشتباہی نظر حکومت کی جو آپ پر تھی، یہ عدم حاضری اسی مصلحت سے تھی۔ الغرض یہ یا اسی نوعیت کی "قیاس شناسیوں" اور "دقیقہ آفرینیوں" کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جو پیش کرنے والوں کی طرف سے پیش ہوتا رہتا ہے۔

حالانکہ "درخت انار" کی چھاؤں میں ایک استاذ والا یہ مدرسہ، اس مدرسہ کے مستقبل کے اعتبار سے خواہ جس حد تک بھی مختصر نظر آرہا ہو، تقطیع اس کی اس زمانہ میں جتنی بھی چھوٹی ہو، لیکن بہرحال وہ عربی ہی کا دینی مدرسہ تھا، جیسے اپنے اس طویل و عریض ہیکل میں بھی دیوبند کا یہ دارالعلوم اس وقت بھی عربی ہی کا دینی مدرسہ ہے شروع میں جس وقت وہ قائم ہوا تھا، اس وقت بھی وہی تھا، درمیان میں بھی وہی رہا، اور اس وقت تک وہی ہے۔ اس سے بڑھ کر محکم و استوار شہادت اس دعوے کے ثبوت کی اور کیا ہو سکتی ہے کہ درخت انار کی چھاؤں میں اس مدرسہ کا ۱۲۸۳ھ میں افتتاح ہوا، مدرسہ کے اسی پہلے سال کی پہلی مطبوعہ روداد میرے سامنے رکھی ہوئی ہے۔ روداد کو ان الفاظ سے شروع کر کے کہ

"الحمد للہ کہ سنہ ۱۲۸۳ ہجری بخیریت تمام ہوا۔"

آگے اسی میں یہ اطلاع دی گئی کہ

"یہ وہ سال مبارک ہے جس میں بناء

"مدرسہ عربی"

کی دیوبند میں قائم ہوئی۔"

نام ہی نہیں، امتحانی کتابوں کے ناموں کی فہرست بھی ہمیں جب یہ ملتی ہے یعنی لکھا ہے کہ شرح وقایہ شرح ملا، میبذی، قطبی، اصول شاشی، سراجی وغیرہا کتابوں میں طلبہ کا امتحان لیا گیا، اسی سے اس

"مدرسہ عربی" کے پہلے سال کے کاموں کا بھی پتہ چلتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بعد کو گیا' اس وقت تک "دار العلوم" کے وسیع تدریسی احاطہ میں چند ابتدائی کلاسیں بھی مقامی ضرورتوں کے پیش نظر قرآن ناظرہ وحفظ' اردو فارسی حساب وغیرہ کی بھی ہیں، لیکن آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ عربی کتابوں کے پڑھائے جانے کے بعد جیسا کہ دوسرے سال کی روداد میں لکھا ہے' ان تحتانی کلاسوں کا اضافہ بعد میں ہوا۔ سنہ ۱۲۸۴ھ کی روداد جو دوسرے سال کی روداد ہے' اس میں یہ لکھتے ہوئے کہ

"جب دیکھا گیا کہ طلبہ مبتدی بیرونجات و دیوبند کی کارروائی' بدون پڑھنے کتب فارسی کے نہیں ہوتی' اور فارسی تعلیم' عربی میں ابتداءً دخل تمام رکھتی ہے' اور نیز خیال کیا گیا کہ اگر کتب فارسی ابتداء سے پڑھائی جاوینگی تو بالضرور لوگ اپنے چھوٹے لڑکوں کو مدرسہ بھیجیں گے' اور اس میں امید قوی ہے کہ رفتہ رفتہ شوق تعلیم عربی ہو" ص۷

جس کا حاصل یہی تو نکلا کہ عربی زبان کی کتابوں کے پڑھائے جانے کے بعد فارسی ادب کی کتابوں کے لئے گنجائش مدرسہ کے نصاب میں پیدا کی گئی' اسی روداد میں آگے اس کی خبر دیتے ہوئے کہ تعلیم قرآن کا درجہ بھی اسی کے بعد کھولا گیا' اور اس سلسلہ میں

"اوائل ماہ ذی الحجہ سے حافظ نامدار خاں جن کی تعلیم اور حفظ قرآن مشہور ہے' بہ تنخواہ پانچ روپیہ ماہوار مقرر ہوئے"۔

ہمارے مصنف امام نے بھی دیوبند میں قیام مدرسہ کی خبر دینے کے بعد جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"چند ہی روز گذرے کہ چندہ کو افزونی ہوئی' اور مدرس بڑھائے گئے' اور مکتب فارسی وحافظ قرآن مقرر ہوئے"۔ ص۳۱

دیکھ رہے ہیں کہ قائم جب ہوا تو "مدرسہ عربی" ہی کے نام سے قائم ہوا' مکتبی کلاسوں کا اضافہ اس "مدرسہ عربی" میں بعد کو ہوا' ایسی صورت میں یہ دعویٰ کہ چھتہ کی مسجد میں دار العلوم کی بنیاد ہی نہیں پڑی تھی' اور اسی لئے کہ وہ ایک مقامی قصباتی مکتب خانہ تھا' سیدنا الامام الکبیر اس کی افتتاحی تقریب میں

شریک نہ تھے۔ خود ہی سوچئے کہ یہ توجیہ واقعات کے مطابق کس حد تک ہو سکتی ہے، پھر مدرسہ کے پہلے سال کی اسی روداد میں

"نام مہتممان"

کے عنوان کے نیچے حسب ذیل ناموں کو جب ہم پاتے ہیں، یعنی

"حاجی عابد حسین، مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی، مولوی مہتاب علی صاحب مولوی ذوالفقار علی صاحب، مولوی فضل الرحمن صاحب، منشی فضل حق، شیخ نہال احمد"

بظاہر "ارکان مجلس شوریٰ" کی تعبیر "مہتمان" کے لفظ سے کی گئی ہے۔ جس کا مطلب یہی ہوا کہ دیوبند میں "مدرسہ عربی" جو قائم ہوا تھا، اس سے اپنے تعلق کو سیدنا الامام الکبیر قطعاً پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ جب "مجلس شوریٰ کے ارکان" میں آپ کا نام شریک تھا۔ وہی طبع بھی ہوا شائع بھی ہوا، تو یہ کہنا کہ ابتدا میں حضرت والا اس مدرسہ سے سیاسی مصالح کے پیش نظر ایسا تعلق رکھنا نہیں چاہتے تھے جس پر حکومت کی نظر پڑ سکتی ہو۔ بجز ایک خود تراشیدہ[1] مفروضہ کے اور بھی کچھ ہے، اسی سال کی روداد میں

[1] احقر کے خیال ناقص میں البلسلہ تاسیس دار العلوم حضرت والا کے کھلکر سامنے نہ آنے کو وقت کی سیاسی مصالح پر محمول کر لیا جانا بھی کوئی ایسی بے سروپا توجیہ نہیں کہ اسے خود تراشیدہ مفروضہ کہہ کر کلیۃً نظر انداز کر دیا جائے۔ اس وقت کے نازک حالات، حضرت والا کا وارنٹ، روپوشی، سرکاری دوشنوں کا پیچھے پیچھے لگا رہنا۔ پھر حضرت والا کے ان جذبات و نظریات کا ماضی سے زیادہ مستقبل کیلئے ہونا جو اس وقت اجراء مدرسہ کی روح اور آج ایک مستقل مکتب خیال اور ملت کی تاریخ بنی ہوئے ہیں اجمن کی رو سے یہ مدرسہ تعلیمی ہونیکے ساتھ ساتھ گویا اہل اللہ کی سیاست کا ایک مرکز بھی تھا، کچھ ایسی باتیں نہ تھیں جو کلیۃً پردۂ خفا میں ہوں یا کم از کم بحیثیت مجموعی حکومت وقت کی نگاہوں سے بالکل اوجھل ہوں۔ ایک صورت میں حضرت والا کا بحیثیت بانی یا بحیثیت کسی ذمہ دار عہدیدار کے سامنے آنا بلاشبہ مدرسہ کو خطرات و مہالک کا شکار بنا سکتا تھا کہ ابتداء ہی سے حکومت وقت کی نگاہیں اس پر کڑی ہو جاتیں جس سے وہ حریت پرور مقاصد بروئے کار نہ آسکتے جن کے لئے یہ تاسیس عمل میں آئی تھی، ان حالات میں حضرت والا کا کسی رسمی ذمہ داری کی صورت سے سامنے نہ آنا اصد مدرسہ کے حق میں سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ بھی نہ ہونے کو نمایاں رکھنا ایک اچھی خاصی سیاسی مصلحت کی صورت ہو جاتی ہے۔ رہا ممبران یا مہتممین کی فہرست میں حضرت والا کا نام شائع ہو جانا ان کی کسی رسمی ذمہ داری کو ظاہر نہیں کرتا اگر اس میں ذمہ داری نمایاں ہوتی ہے تو ایک جماعت کی، اور وہ بھی اعزازی جس کا کسی مسئولیاتی منصب سے تعلق نہیں ہوتا پھر جس میں اکثریت ایسے حضرات کی تھی جو تارک الدنیا اور مسجد نشین بزرگ تھے جنھیں (باقی اگلے صفحہ پر)

"امتحان سالانہ"

کا عنوان قائم کر کے یہ رپورٹ درج کی گئی ہے کہ

"ماہ شعبان ۱۲۸۳ھ میں فاضل کامل مولوی محمد قاسم نانوتوی نے بہ شمول مولوی مہتاب علی و مولوی ذوالفقار علی صاحب نہایت مستعدی اور سرگرمی سے امتحان لیا۔" ص ۲

کام کرنے کیلئے دیر تھ بجو دیوبند مجلس شوریٰ میں شریک ہوتے، طلبہ کا امتحان لینے کیلئے آسکتا تھا اسی مدرسہ کا سنگِ بنیاد جب رکھا جا رہا تھا، افتتاح مدرسہ کی اس تاریخی مجلس ہی بجائے حاضر ہونے کے غائب و الگ کیوں ہو گیا؟ اور غائب ہو کر آخر اس مدرسہ کے اجراء و افتتاح سے اسکے تعلق کی کیا نوعیت تھی؟ یقیناً مندرجہ بالا "معلومات" کے پیش نظر ایک دلچسپ سوال بن جاتا ہے۔ خدا جانے دماغوں میں اسکی اور کیا کیا توجیہیں آئی ہیں یا آسکتی ہیں، لیکن میں کیا عرض کروں۔ اترائے

(گذشتہ صفحہ سے) سیاسیات سے تو بجائے خود، عام شہری معاملات سے بھی کوئی خاص لگاؤ نہ تھا اور یا ایسے بزرگوں کی تھی جو گورنمنٹ کے قدیم ملازم اور حال پنشنر تھے جن کے بارہ میں گورنمنٹ کو شک و شبہ کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ ایسے رلے ملے ناموں میں قدرتاً کسی خاص شخصیت پر نگاہ عادۃً نہیں پڑ سکتی۔ اس پر بھی مخالفین مدرسہ نے حضرت ہی کے تعلق کو بنیاد قرار دیکر مدرسہ کو حکومتِ وقت کی نگاہوں میں مشتبہ کر دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ بغاوت کے الزامات بھی لگائے اور غیر ممالک سے سازش کی تہمتیں بھی تراشیں حتیٰ کہ گورنمنٹ کو تحقیقات کرانی پڑی۔ اس وقت یہی حضرات آگے بڑھے اور اپنے سرکاری اعتماد کو سامنے رکھکر مدرسہ کی طرف سے صفائی پیش کی جو کارگر ہوئی۔ ورنہ اگر شخصی طور پر عہدیدارانہ ذمہ داریوں کے ساتھ حضرت والا۔ آگے آئے ہوئے ہوتے تو ظاہر ہے کہ مدرسہ کی طرف سے ان بزرگوں کی یہ صفائی اور یقین دہانی کبھی بھی کارگر نہ ہو سکتی۔ گویا حضرت والا کا پس پردہ رہنا جس مصلحت سے تھا عملاً اس کا خوشگوار نتیجہ ظاہر بھی ہوا۔ اسلئے حضرت والا کی یہ حکمت عملی کہ مدرسہ کے سب کچھ ہونے کے باوجود وہ کچھ بھی نہ ہونا ہی دکھانا چاہتے تھے اور نہ صرف تاسیس مدرسہ ہی کی حد تک بلکہ آخر تک اسی کو نباہا گیا۔ بلاشبہ وقتی مصالح کے لحاظ سے ایک حکیمانہ روش تھی جس کو سیاسی مصلحت کے سوا اور کس نام سے تعبیر کیا جائے؟

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس اختفاء و تستر میں حضرت والا کی قلبی افتاد اور روحانی کسرِ نفسی اور تواضع کو بھی کافی دخل تھا اور کوئی شبہ نہیں کہ جس طرح وہ امامت، خطابت، زعامت، مشیخت، افتاء اور تمام امتیازی مواقع سے گھبراتے تھے اسی طرح کار ہائے مدرسہ کی قیادت سے بھی یقیناً گریز فرماتے رہے جیسا کہ حضرت مصنف دام مجدہٗ کا نظریہ ہے اور واقعہ بھی ہے لیکن ان دونوں باتوں یعنی سیاسی مصلحت اور قلبی تواضع میں کوئی منافات نہیں۔ اگر قلبی افتاد کے ساتھ عقل کی انگیز بھی شامل ہو جائے تو اہل اللہ کے لئے یہ جمع اضداد کچھ مشکل نہیں۔ ایسے لوگوں کے قلب سلیم کی مقاماتی ترقی میں عقل معین ہوتی ہے اور عقل کے اونچے اونچے نظریات میں قلب کی سلامتی مددگار ہوتی ہے۔ اسلئے ہو سکتا ہے کہ قلب نے اپنے راستہ سے اور دماغ نے اپنے طریق سے حضرت والا کو اس باہمہ و بے ہمہ حکمت عملی پر قائم کیا ہو، نظر بریں ہم اسے اعلیٰ ترین تواضع بھی کہہ سکتے ہیں اور بہترین سیاسی مصلحت کا عنوان بھی دے سکتے ہیں۔

محمد طیب غفرلہٗ

اور اگر شہ نے اپنے ہمجولی بچوں پر برتری اور فوقیت حاصل کرنیکا ذریعہ یاد ہو گا عید کے اسی جوڑے کو جس نے پھونک کر رکھ دیا تھا طفولیت کے ایام بیہوشی میں جو ہوش کی ایسی باتیں کرتا تھا کہ بڑے بڑے ہوشیاروں سے بھی جنکی ہم توقع نہیں کر سکتے، لکھے پڑھے، حتیٰ کہ کھیلنے، کودنے تک کے شغلوں میں کام کو انتہائی منزلوں تک پہنچانے میں کامیاب ہونے کے ساتھ ہی نام اور شہرۂ عام کے موقعہ پر جس کا جبلّی بچپنہ، اور دوامی وطیرہ بجائے حاضری کے غائب ہو جانا ہی قرار پا چکا ہو، ساری بلندیاں جن پر چڑھ چڑھ کر بجانے والے اپنے اپنے فضل و علم کی ڈگڈگیاں پہلے بجاتے تھے، یا آج تک بجا رہے ہیں، کیا ہمیشہ ان سے اُتر بیٹھنے ہی پر اصرار کرتے ہوئے اسے نہیں پایا گیا، حکومت کی ملازمت یا وکالت جیسی باتوں کو تو خیر دور رکھیئے، آپ سن چکے کہ جس زمانہ میں اس کے دیوان علم کے رفقاء وسیع صحراؤں کی طرف بگٹٹ بھاگے چلے جاتے تھے، ٹھیک ان ہی دنوں میں وہ دلّی کے کوچہ چیلان نامی کے ایک مکان میں چھلنگے پر پڑا ہوا تھا۔ اسی طرح امامت، خطابت، افتاء، دراست، تصنیف و کتابت، حتیٰ کہ ارشاد و بیعت تک کی راہوں میں آپ دیکھ چکے کہ کبھی وہ خود آیا نہیں، بلکہ لایا گیا، علم و دین کی ان نمائش گاہوں پر خود چڑھا نہیں، بلکہ چڑھایا گیا، بزور جبر چڑھایا گیا، پھر کام کے بعد آج بھی نام کے مقام پر وہ کیوں ڈھونڈھا جا رہا ہے، جو اس مقام پر پہلے کب اور کہاں پایا گیا تھا۔ ان ہی پنہانیوں میں تو عرض کر چکا ہوں۔ اس کی "پیدائیوں" کا راز پوشیدہ ہے، آج اس کے ظہور کی شدت ممکن ہے، بعضوں کے لئے ناقابلِ برداشت بنی ہوئی ہو۔ سرگوشیاں ہو رہی ہیں کہ وہ تو غائب تھا۔ پھر ہر جگہ وہی وہ آج کیوں پایا جا رہا ہے۔ شاید قرآنی قانون واللہ مخرج ما کنتم تکتمون اور اس کی تفسیر جو انہیں سنائی گئی تھی، اسے وہ بھول گئے، حالانکہ چاہیئے تھا کہ بجائے اس کے ان معلومات کا جائزہ لیتے، اور ان میں اپنے اس سوال کا جواب تلاش کرتے جو ان کے "حافظہ" سے امید ہے کہ ابھی غائب نہیں ہوئے ہوں گے، کچھ بھی ہو، سچی بات یہی ہے، یہی واقعہ ہے، اور اسی کو واقعہ ہونا بھی چاہیئے کہ "جامعہ قاسمیہ" یا "دیوبند کے دارالعلوم" کی جب بنیاد پڑی تھی تو سیدنا الامام الکبیر اس وقت دیوبند میں موجود نہ تھے اسی لئے قیام دارالعلوم کی ابتدائی داستان میرے دائرہ بحث سے سچ پوچھئے تو خارج ہے۔

ان جزئیات کی سراغ رسانی یعنی مقامی طور پر "مدرسہ عربی" کے نام سے دیوبند کے قصبہ میں اس تعلیم گاہ کا افتتاح کب اور کن مقامی بزرگوں کی تحریک و تجویز سے ہوا۔ ان باتوں کی تحقیق کا صحیح مقام سیدنا الامام الکبیر کی سوانح عمری نہیں، بلکہ دارالعلوم کی تاریخ ہو سکتی ہے، لیکن آئندہ کی کڑیوں کی حلقہ بندی کے لئے یہاں بھی ضرورت ہے کہ ذیلی طور پر ان معلومات کو اس کتاب میں بھی درج کر دیا جائے، جو ان امور کے متعلق اب تک سیدنا الامام الکبیر کے اس ظلوم و جہول سوانح نگار تک پہنچے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ شاملی کے میدان کا زخم خوردہ شیر، اس میدان سے واپس ہونے کے بعد نئے داؤ اور نئے گھات کے لئے کسی نئی "کمین گاہ" کی تلاش میں جب سرگرداں تھا، تو جیسا کہ عرض کر چکا ہوں اس کا پتہ چلانا تو دشوار ہے کہ اس زمانہ میں ان کی نظریں کہاں کہاں کن کن لوگوں پر پڑ رہی تھیں، تاہم قرائن و قیاسات کا اقتضاء ہے کہ سہارنپور تھانہ بھون مرادآباد میرٹھ وغیرہ جیسے مقامات جہاں سے آپ کے خاص تعلقات تھے۔ ان ہی کے ساتھ ساتھ کوئی وجہ نہ تھی کہ دیوبند اور اس کے امکانات آپ کے سامنے نہ آئے ہوں، جو اب بجائے نانوتہ کے آپ کا وطن ثانی بھی بن چکا تھا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اپنے اس

"کچھار"

کے پروردہ شیر بچوں سے جو آپ ہی کی آغوش تربیت میں پل رہے تھے، آپ کے طبعی رجحانات و میلانات "خو و بو" کو آپ کی "مجلس انس" میں شریک ہو ہو کر شعوری و غیر شعوری طور پر جو چوس رہے تھے ان ہی شیر بچوں سے توقعات کی لہریں آپ کے قلب مبارک سے زیادہ ٹکراتی ہوں، ان ہی سے آپ کا دل زیادہ امیدیں باندھتا ہو، تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے۔ لیکن بایں ہمہ اس کا کوئی تاریخی وثیقہ ہمارے پاس نہیں ہے کہ قیام مدرسہ کی تاریخ و سنہ یا اُس کے ابتدائی مبادی طے کرنے کیلئے بعید وقت صاف صاف دو ٹوک الفاظ میں "دیوبند" کے باشندوں کو کوئی واضح تصریحی حکم آپ نے دیا تھا۔ اگرچہ آپ کی ہر حرکت اور ہر سکون ساری زندگی اس میں شک نہیں کہ مجسم سوالیہ نشان بنی ہوئی تھی، لیکن اس سوال کا جواب کہاں سے آئیگا؟ اور کون لوگ لبیک کہینگے؟ اسی کے انتظار میں دن پر دن، مہینوں پر مہینے، سال پر سال گذرے چلے جاتے

تھے، ایک سال دو سال، تین سال، تا ایں کہ قریب تھا کہ سالوں کا ایک دہا یا عشرہ بھی گذر جائے
اسی سوال کا جواب زمین پر بھی ڈھونڈھ رہا تھا اور عرض کر چکا ہوں، کہ تلاش کرنے والا آسمانوں میں
بھی اسی سوال کے جواب کو تلاش کر رہا تھا، کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں جب میرٹھ کا شہر اور اس
کے مطبع مجتبائی میں انتظار کی گھڑیاں کاٹے نہیں کٹ رہی تھیں کہ دیوبند سے یہ "بشارت نامہ"
موصول ہوا، یعنی حاجی عابد حسین صاحب نے سیدنا الامام الکبیر کو میرٹھ خط لکھا، جس کا
اقتباس تذکرۃ العابدین میں دیا گیا ہے۔ حاجی نذیر احمد صاحب مصنف تذکرۃ العابدین یہ اطلاع
دیتے ہوئے کہ حاجی عابد حسین صاحب نے مدرسہ کے سلسلہ میں چندہ شروع کر دیا، خود بھی دیا اور
دوسروں سے بھی لیا اور جمع کیا۔ آگے لکھتے ہیں

"اگلے روز حاجی صاحب (حاجی عابد حسین صاحب) نے مولوی محمد قاسم صاحب کو میرٹھ
خط لکھا کہ آپ پڑھانے کے واسطے دیوبند آئیے۔ فقیر نے یہ صورت (فراہمی چندہ) اختیار
کی ہے۔" (تذکرۃ العابدین ص ۶۹ مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی)

اس خط کے بارہ میں جو بیان مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی استاد دار العلوم دیوبند کا شامل مواد
سوانح قاسمی ہے اس میں اس خط کے کچھ اور فقرے بھی ملتے ہیں۔ جن سے بعض دوسرے پہلوؤں پر
بھی روشنی پڑتی ہے۔ مولانا ممدوح لکھتے ہیں

"حاجی عابد حسین صاحب کا یہ خط میں نے حاجی نذیر احمد صاحب کے پاس بچشم خود
دیکھا ہے اور مجھے اس کا مضمون بجنسہ قریب قریب اسی کے الفاظ میں پوری طرح محفوظ ہے
اس خط میں حاجی صاحب نے مولانا مرحوم کو لکھا ہے، کہ وہ جو آپ کے ہمارے درمیان
مختلف مجالس میں مذاکرات ہوا کرتے تھے کہ کوئی مدرسہ قائم ہونا چاہئے۔ کیونکہ ایک
ایک سوال پوچھنے کے لئے سہارنپور آدمی بھیجنا پڑتا ہے۔ فقیر کے دل میں اک دم
خیال آ گیا اور چندہ کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔ کل عصر مغرب کے درمیان تین سو روپے ہو گئے۔ اب
آپ تشریف لے آئیے۔ (فائل مسودات مواد سوانح)

یہ سوال کا جواب اور لبیک کی پہلی آواز تھی جو خوش قسمت دیوبند اور اس کے خوش نصیب، توفیق یافتہ باشندوں کی طرف سے تقریباً دس سال کی "تاذین عام" کے بعد پہلی دفعہ سیدنا الامام الکبیر کے "قلب منتظر" سے ٹکرائی، سب پیچھے رہ گئے، دیوبند سب سے آگے بڑھ گیا اور الفضل للمتقدم "کا" قدرتی حق" ضلع سہارنپور کے اس گمنام قصبہ "دیوبند" کے طالع ارجمند کے لئے ہمیشہ کے واسطے محفوظ ہو گیا، سبقت اور پیش قدمی کا ایسا حق جو کوئی اس سے اب چھین نہیں سکتا۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء

مندرجہ بالا "بشارت نامہ" حضرت سید حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارقام فرمودہ تھا جو چھتہ کی مسجد کی "مجلس انس" کے رکن رکین تھے

بشارت نامہ کے ان دونوں اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ارسال بشارت نامہ تک حضرت حاجی سید محمد عابد صاحب کی مساعی صرف فراہمی چندہ تک محدود رہیں۔ تعلیم کا افتتاح یا مدرسہ کا اجراء عمل میں نہیں آیا تھا، اسی کے لئے انہوں نے سیدنا الامام الکبیر کو یاد فرمایا۔ اور ان مذاکرات کا حوالہ دے کر یاد فرمایا جو اجراء مدرسہ کے سلسلہ میں ان میں اور سیدنا الامام الکبیر میں ہوا کرتے تھے۔ گویا یہ اقدام ان مذاکرات کے نتیجہ کے طور پر ایک باہمی سمجھوتہ یا ایک معہود فی الذہن منصوبہ کے تحت عمل میں آیا تھا۔

ابتدائی مراحل کی اطلاع بشارت نامہ کے ذریعہ میرٹھ پہنچی۔ جس کے قلب میں ۱۸۵۷ء کے بعد سے ایک اساسی مقصد کی آگ لگی ہوئی تھی، اور جس کے بروئے کار آنے ہی پر بظاہر اسباب مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کی تعمیر ہونے والی تھی۔ جس کے لئے ۱۸۵۷ء ہی سے دیوبند کی آمد و رفت مسجد چھتہ کی مجلس انس اور مذاکرات و تصرفات کا ایک لمبا سلسلہ قائم کیا گیا تھا۔ آج جبکہ اسی مقصد کے بارہ میں

لہ اقتباس از آیت واذن فی الناس بالحج یاتوک رجالا و علی کل ضامر یاتین من کل فج عمیق۔ افتتاح بناء دارالعلوم کے سلسلہ میں اسی آیت کے مضمون سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اقتباس کر کے اپنے استاذ حضرت نانوتوی کے بارہ میں یہ شعر لکھا ہے۔ اس کی آواز تھی یا بانگ خلیل اللّٰہی - کعبہ کے لبیک چلے اہل عرب اہل عجم۔ اسی تاذین اور اس کی لبیک کی داستان کی طرف حضرت مصنف لفظ تاذین سے اشارہ فرما رہے ہیں۔ محمد طیب غفرلہ

عملی لبیک کی خوش خبری سامنے آئی تو سیدنا الامام الکبیر کی خوشی ومسرت کا آج کون اندازہ کر سکتا ہے،
اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت جلد سے جلد اصل مقصد کی عملی تکمیل کا ولولہ کس حد تک قلب مبارک میں
جوش زن ہوا ہوگا۔ اس بشارت نامہ کے جواب میں آپ نے جو والا نامہ تحریر فرمایا' اس کا یہ متعلقہ حصہ
صاحب تذکرۃ العابدین نے نقل کیا ہے جس کے الفاظ بجنسہ یہ ہیں۔

"مولوی محمد قاسم صاحب نے جواب لکھا کہ میں بہت خوش ہوا۔ خدا بہتر کرے' مولوی ملا
محمود صاحب کو پندرہ روپے ماہوار مقرر کر کے بھیجتا ہوں۔ وہ پڑھا دینگے' اور میں مدرسہ
مذکور کے حق میں ساعی رہوں گا" (تذکرۃ العابدین ص ۶۹)

سیدنا الامام الکبیر کے اس اذن اور عملی پیشقدمی پر جو تعمیلی صورت دیوبند میں نمودار ہوئی اس کے
بارہ میں صاحب تذکرۃ العابدین ہی نے یہ اطلاع دی ہے

"چنانچہ ملا محمود صاحب آئے اور مسجد چھتہ میں عربی پڑھانا شروع کیا"

(تذکرۃ العابدین ص ۶۹)

حاجی محمد عابد صاحب کے اس بشارت نامہ اور سیدنا الامام الکبیر کے جوابی والا نامہ سے یہی
معلوم ہوتا ہے اور سوچنے والے اس کے سوا اور سوچ ہی کیا سکتے ہیں کہ دیوبند میں تعلیم کی اجتماعی شکل
میں "نئے محاذ" کا افتتاح سیدنا الامام الکبیر ہی کے منشاء وصوابدید کے مطابق اور آخر کار انہی
کے اذن صریح بلکہ افتتاح مدرسہ کے بارہ میں عملی پیش قدمی سے عمل میں آیا تھا۔ جس کے لئے سربراہ
کار حضرت حاجی سید محمد عابد صاحب تھے، گویا سیدنا الامام الکبیر نے اگر ابتدا ہی سے انہیں اس
کام کے لئے نگاہ میں رکھ کر چھتہ کی مسجد کا قیام اختیار فرمایا تھا۔ جیسا کہ سوانح مخطوطہ کی عبارت اس کے
بارہ میں پیش کی جا چکی ہے۔ پھر مذاکرات کی داغ بیل ڈالی تھی، جیسا کہ حاجی صاحب
اس بشارت نامہ کی عبارت سے واضح ہے تو حاجی صاحب ہی اس سلسلہ میں آگے بڑھے انہوں
نے ہی قیام مدرسہ کے ابتدائی مراحل (فراہمی چندہ) طے کئے اور انہوں نے ہی حضرت والا کو
بشارت نامہ بھیجکر گویا استیذان کیا اور بالآخر حضرت والا کے اذن اور مدرس بھیجنے پر چھتہ کی مسجد میں

مدرسہ کا افتتاح عمل میں آگیا۔

باقی یہ جو لوگ پوچھتے ہیں کہ مقامی طور پر مدرسہ کے افتتاح کی دیوبند میں کیا صورت پیش آئی؟ تحریک و تجویز میں کس نے پہل کی؟ وغیرہ سو میرے نزدیک تو یہ اسی قسم کا سوال ہے کہ دیوبند کے بعد سہارنپور، مراد آباد، تھانہ، کیرانہ، نگینہ، گلاوٹھی، مظفر نگر، رڑکی، انبہٹہ وغیرہ آس پاس کے قریٰ و امصار میں سیدنا الامام الکبیر ہی کے منشاء و ایماء کے متعلق مقامی درسگاہیں وقتاً فوقتاً جیساکہ آگے معلوم ہوگا کھلتی رہیں، ان کے متعلق یہ تحقیق کی جائے کہ مقامی طور پر ان مقامات میں سب سے پہلے کس نے "درسگاہ" کے قیام کی تجویز پیش کی، تجویز کو کن کن لوگوں نے پہلی دفعہ قبول کیا، اور اہتمام و انتظام کا بار کن بزرگوں نے اپنے اوپر لیا، میرے نزدیک کوئی قابل توجہ بات نہیں۔

تاہم اس وقت مسجد چھتہ کی مجلس انس کے سر برآوردہ اور ذمہ دار اراکین میں حضرت حاجی سید محمد عابد صاحب اپنے تقدس اور درویشی کی حیثیت سے مقبول خلائق اور دیوبند میں مرجع عوام و خواص بنے ہوئے تھے جن کے بارہ میں مولانا ذوالفقار علی صاحب کا یہ فقرہ نقل کیا جاتا ہے کہ مدرسہ دیوبند کو سلطان روم بھی بغیر حاجی محمد عابد صاحب کی مدد کے نہیں چلا سکتا اور مولانا فضل الرحمن صاحب نے اپنی مشہور نظم میں انہیں "مرد حق"۔ "عابد صداقت کیش" اور "طائر ہمایوں فال" وغیرہ کے الفاظ سے یاد کر کے اپنی گہری عقیدتمندی کا ثبوت دیا ہے، اور ادھر یہ دونوں نامبردہ بزرگ یعنی مولانا ذوالفقار علی صاحب اور مولانا فضل الرحمن صاحب جیساکہ میں ذکر کر چکا ہوں اپنی علمی حیثیت اور تعلیمی تجربہ کے لحاظ سے قصبہ میں ممتاز تھے۔ بقول مصنف امام ان تینوں حضرات نے تجویز کی اور گویا ارادہ کیا کہ دس سال سے جس کام کے لئے قلوب مستعد ہوتے چلے آرہے تھے اب وہ کام بروئے کار لایا جائے۔ پھر اس مبارک کام کو چھیڑنے کے لئے تحریک ان میں سے پہلے کس نے کی؟ سو تذکرۃ العابدین کی روایت کے مطابق حضرت حاجی محمد عابد صاحب نے اور سوانح مخطوطہ کی روایت کے مطابق مولانا فضل الرحمن صاحب نے، ہمارے نزدیک یہ دونوں روایتیں متعارض نہیں ہیں۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ دونوں بزرگوں نے کی۔ کیونکہ جیساکہ ذکر آچکا ہے کہ مسجد چھتہ کی مجلس انس کی تاثیری کارفرمائیوں سے

جبکہ یہ کام ان سب ذہنوں کی مشترک پکار بن چکا تھا تو جو زبان بھی پہلے ہلی۔ اُس نے اپنی ساتھ دوسرے کی ترجمانی بھی کی، اسلئے ہم اس پہل کو تذکیر سمجھتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وقتاً فوقتاً یہ صدا کبھی کسی کی زبان پر اور کبھی کسی کی زبان پر آتی رہی جو دوسروں کو اُبھارنے اور یاد دلانے کے لئے ہوتی تھی۔ کچھ بھی ہو، بہر حال اچانک دیکھا یہ گیا کہ حاجی محمد عابد صاحب تن تنہا گلے میں جھولی ڈال کر چندہ کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے جس کی تفصیلی روایت آگے آرہی ہے، اور روپیہ جمع کرکے اصل مقصد یعنی افتتاح تعلیم واجرار مدرسہ کے لئے سیدنا الامام الکبیرؒ کی خدمت میں میرٹھ بشارت نامہ بھیجدیا، اور وہاں کی تصویب و تاذین اور مدرس کا تقرر کرکے بھیجدینے پر افتتاح مدرسہ عمل میں آگیا، جیساکہ ابھی آپ پڑھ چکے ہیں، حاصل اس کا یہی ہوا کہ اسی کے ہاتھوں اس کام نے عملی قالب اختیار کیا۔ جس کے قلب کا یہ جذبہ تھا، اور جس نے دوسرے قلوب کو بھی اس تپش سے تیار رکھا تھا۔ یعنی اجرا مدرسہ حضرت والا نے کیا گو پس پردہ میرٹھ میں بیٹھ کر کیا۔ لیکن عملاً اس کام کو چلانے اور آگے بڑھانے کے لئے بہر حال ایک ایسی مقامی شخصیت کی ضرورت تھی جو اپنے اثر واقتدار سے "مالی سرمایہ" کے فراہم کرنے میں بھی کامیاب ہو سکتا ہو، اور اسی کے ساتھ بڑا اہم مسئلہ یہ تھا کہ ہمہ وقتی نگرانی کے لئے دوسرے مشاغل سے وہ آزاد بھی ہو، کہہ چکا ہوں کہ ان دونوں خصوصیتوں یعنی اثر واقتدار اور "ہمہ وقتی توانائی" کی جو ضرورت اس ادارہ کو عملی گردش میں لانے کے لئے تھی۔ ان دونوں جوہری خصوصیتوں کی جامع ذات اس زمانہ میں حضرت حاجی محمد عابد صاحب قبلہ کے سوا جہاں تک معلومات کا تعلق ہے دیوبند میں اس وقت شاید کوئی دوسری ہستی نہ تھی، حاجی صاحب کا اثر اور کافی گہرا اقتدار مسلمان مردوں اور عورتوں ہی کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ قصبہ کی غیر مسلم آبادی میں بھی جیساکہ سن چکے، اپنے خاص حالات کے لحاظ سے وہ کافی مقبول اور ہر دل عزیز تھے، اور صرف یہی نہیں بلکہ سوانح مخطوطہ کے باخبر مصنفؒ نے حاجی صاحب کے متعلق یہ بیان کرتے ہوئے کہ

لہ پہلے تو ان کی شخصیت کچھ مجہول سی تھی لیکن معلومات ان کے متعلق جو فراہم ہوئے ہیں، ان کی روشنی میں تو دارالعلوم دیوبند کی تاریخ میں ان کی ہستی کافی ممتاز اور اہم بن جاتی ہے۔ مولانا طیب صاحب کے (باقی اگلے صفحہ پر)

"آپ کی صورت کو دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔"

آگے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ

"پابندیٔ وضع، استقلال طبع، اولوالعزمی، خوش تدبیری آپ کی مشہور ہے۔"

اور کو لکھنے کے بعد اپنے مسودہ میں ان الفاظ کو نہ معلوم کیوں قلم زد کر دیا گیا ہے۔ لیکن بہر حال ہیں یہ قلم زدہ الفاظ بھی ان ہی کے قلم سے نکلے ہوئے، اور وہ یہ ہیں کہ

"باوجودیکہ (حاجی عابد صاحب نے) دنیا کو ترک کر دیا، مگر کوئی آپ سے مشورہ لیتا ہے، تو اس میں بھی ایسی اچھی صائب رائے ہوتی ہے، جیسے بڑے ہوشیار دنیا دار کی۔"

شاید آخری الفاظ میں کچھ تعبیری خامی محسوس ہوئی، اسی لئے وہ کاٹ دیئے گئے، مگر میرے سامنے جو سوال ہے اسکے حل میں ان کے قلم کے نکلے ہوئے یہ تاریخی الفاظ کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ سمجھ میں آتا ہے کہ "اثر" و "فرصت" کے سوا حاجی صاحب میں وہ ساری خوبیاں جمع تھیں جن میں کسی اجتماعی نظام کے تحت چلائے جانیوالے ادارہ کی فلاح و بہبود، بقاء و ارتقاء کی ضمانت پوشیدہ ہے، حاصل یہی ہے کہ صاحب دل ہونے کے ساتھ حاجی صاحب "صاحب دماغ" بھی تھے۔

(گذشتہ صفحہ سے) بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے مصنف دیوبند ہی کے ایک بزرگ منشی فضل حق نامی ہیں، یہ وہی منشی فضل حق صاحب ہیں، جن کا اسم گرامی دارالعلوم دیوبند کی سب سے پہلی مجلس شوریٰ کے ارکان کی اس فہرست میں درج ہے جو مدرسہ کے پہلے سال ۱۲۸۳ھ کی روداد میں شریک ہے، گویا ابتدا ہی سے مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے اور آخر تک رہے۔ دارالعلوم کی بعض قدیم رودادوں سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ۱۳۱۰ھ ہجری میں حاجی سید عابد حسین صاحب کی تحریک اور قطب ربانی حضرت گنگوہی کی توثیق سے منشی فضل حق دارالعلوم کے مہتمم بھی مقرر ہوئے تھے۔ حاجی عابد حسین صاحب نے اپنی تحریک مجلس شوریٰ میں جن الفاظ میں پیش کی تھی ان کی ذاتی خصوصیات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ تحریک کے الفاظ یہ تھے۔ "منشی فضل حق ابتداء مدرسہ سے داخل اہل شوریٰ ہیں اور پہلے عرصہ تک اہتمام کا کام کر چکے ہیں، اور استعداد تحریر و تقریر کی واقفی رکھتے ہیں، اور تدابیر و قوت انتظامیہ کی بھی عاری نہیں ہیں" منشی صاحب کا خاندان اوپر کی پشتوں کے حساب سے حاجی عابد حسین صاحب کے مل جاتا ہے، خود سیدنا الامام الکبیر کی بھی سسرالی رشتہ آپ کا تھا۔ (محلہ ابوالبرکات) منشی صاحب کے ایک صاحبزادے مولٰنا ظہور الحق صاحب مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں مدرس ہیں، اور ڈاکٹر شفیق احمد صاحب منشی صاحب مغفور کے نواسے ہیں، جو آج کل دیوبند کے ممتاز معالجوں میں شمار ہوتے ہیں۔ مولٰنا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ منشی صاحب کا مکان دیوبند کے محلہ سرائے میں اب بھی موجود ہے، ان کے خاندان والوں سے مولانا کے گھرانے سے خوش گوار گہرے تعلقات ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس انکشاف کے بعد "سوانح مخطوط" اور اس کے مشتملات کی قدر و قیمت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ ۱۲

بلکہ صاحب دل وصاحب دماغ ہونے کے ساتھ ساتھ حاجی صاحب کے متعلق اس قسم کے معلومات ہم تک جو پہنچے ہیں۔ مثلاً ارواح ثلاثہ میں حضرت تھانوی کی یہ روایت پائی جاتی ہے، حضرت والا اپنے استاد مولٰنا فتح محمد صاحب کے حوالہ سے بیان فرمایا کرتے تھے کہ دارالعلوم دیوبند میں مولٰنا فتح محمد صاحب جب زیر تعلیم تھے، توکسی ضرورت سے وہ حاجی سید محمد عابد صاحب قبلہ کی خدمت میں پہنچے، اس وقت وہی مدرسہ کے مہتمم بھی تھے۔ لیکن ٹھیک اسی وقت کوئی ڈپٹی صاحب بھی حاجی صاحب کی ملاقات ہی کی غرض سے آدھمکے۔ حاجی صاحب نے حد سے زیادہ لاپروائی سے گویا کام لیتے ہوئے ڈپٹی صاحب سے سرسری گفتگو کی، اور اٹھ کر جانا ہی چاہتے تھے کہ مولٰنا فتح محمد جن کی حیثیت اس زمانہ میں مدرسہ کے ایک معمولی طالب علم سے زیادہ نہ تھی، دیکھا کہ وہ آرہے ہیں، ان پر نظر کا پڑنا تھا کہ پلٹ پڑے اور اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر مولوی صاحب سے آنے کی وجہ دریافت فرمانے لگے، مولوی فتح محمد صاحب نے یہ دیکھ کر کہ حاجی صاحب جارہے تھے، خواہ مخواہ میری وجہ سے ان کو رکنا پڑا۔ ادباً عرض کرنے لگے کہ کوئی خاص بات نہ تھی۔ پھر کبھی عرض کردوں گا، مگر ان کو حیرت ہوگئی، جب وہ حاجی صاحب کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے ان الفاظ کو سن رہے تھے۔

"تم اپنے کو ڈپٹی صاحب پر قیاس کرتے ہوگے، کہاں وہ دنیادار اور کہاں تم نائب رسول" ارواح ص ۲۶۹

اسی کتاب ارواح ثلاثہ میں ایک دوسری روایت بھی پائی جاتی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مدرسہ کے کسی طالب علم اور حاجی صاحب کے درمیان باہمی رنجش کی کوئی صورت پیش آگئی تھی، طالب العلم نے منھ پر حاجی صاحب کو کچھ سخت وسست بھی سنا دیا تھا، طالب العلم ایک مسجد میں رہتا تھا، لکھا ہے کہ حاجی صاحب اسی مسجد میں بنفس نفیس پہنچے، دیکھا جارہا تھا کہ طالب العلم کے

"سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھے ہیں۔ فرمایا کہ مولانا معاف کردیجئے۔ آپ نائب رسول ہیں، آپ کا ناراض رکھنا مجھے گوارا نہیں" ص ۲۶۹

"ملا اور صوفی" کے تعلقات جن کی طرف کتاب کے تمہیدی مقدمہ میں بقدر ضرورت بحث بھی کی گئی ہے۔
اور یہ جانتے ہوئے کہ حاجی سید محمد عابد صاحب پر درویشی ہی کا پہلو ابتدا سے غالب تھا گو شریعت
کے ظاہر احکام کی پابندی میں بھی جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، وہ خاص امتیازی شان رکھتے تھے،
لیکن بجائے انقباض کے غریب ملاؤں کی، حاجی صاحب کی درویشی میں اتنی گہری جگہ جس کا اندازہ
مذکورہ بالا مثالوں سے ہوتا ہے۔ اب خواہ یہ رنگ جس راستہ سے بھی آیا ہو، ۱۲۸۳ھ کے بعد
دیوبند کو وطن ثانی بننے کی عزت سیدنا الامام الکبیر کی بدولت جو حاصل ہوئی، اور چھتہ کی مسجد میں جو
حلقہ درویشوں کا اس کے بعد قائم ہوا، بظاہر تو یہ اسی حلقہ کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس زمانہ
میں جیسا کہ گذر چکا اس رنگ کے سب سے بڑے علمبردار حضرت قبلہ حاجی امداد اللہ صاحب
سے بھی حاجی صاحب کا رشتہ قائم ہوا، اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ خلافت کی سعادت بھی آستانۂ
امدادی کے حاجی محمد عابد صاحب کو حاصل ہوئی تھی۔ لیکن یہ بہت بعد کی باتیں ہیں[1]۔ بظاہر یہ قصے
اس وقت کے ہیں جب دیوبند میں عربی کا مدرسہ شروع شروع میں قائم ہوا تھا۔ اس وقت تک
حاجی عابد حسین صاحب میں یہ رنگ اس زمانہ کے لحاظ سے اگر منتقل ہو سکتا تھا تو مسجد چھتہ کی قاسمی
نخل ہی سے منتقل ہو سکتا تھا۔ شاید اسی کی طرف مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے اشارہ فرمایا ہے۔
جو ان کے ایک قصیدہ کے شعر میں پایا جاتا ہے۔

لیک این طائرِ ہمایوں[2] فال شد ز قاسم عطا پر و بالش

بہر حال صاحب دل، صاحب دماغ ہونے کے ساتھ علماء اور علماء کے علم کی عزت و احترام
اور اسی قاسمی تصرفات سے پیدا شدہ غیر معمولی جذبہ جو حاجی صاحب میں پیدا ہو گیا تھا۔ یہ سارے
اسباب و وجوہ تھے ہی ایسے کہ مدرسہ کے افتتاح کی تجویز کو عملی شکل میں لانے کے لئے
نظر انتخاب دیوبند میں حاجی صاحب کے سوا آپ خود سوچئے، اور کس پر پڑتی؟ سارے

---

[1] ۱۲۹۸ھ میں معلوم ہوا ہے حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے ان کو خلافت حاصل ہوئی، یعنی قیام مدرسہ کے پندرہ سال بعد۔ ۱۲
[2] یعنی حاجی محمد عابد صاحب ۱۲

سازوسامان جن کی اس مہم کی سرانجامی میں ضرورت تھی یا ہوسکتی تھی، ان سے وہ لیس تھے۔ بہرحال حاجی عابد صاحب جب کام ہاتھ میں لینے کے لئے آمادہ ہوگئے، تو جیساکہ سوانح مخطوطہ کے مصنف کا بیان ہے، اور ان کا یہ بیان کافی اہمیت رکھتا ہے، لکھا ہے کہ

"ایک دن بوقت اشراق سفید رومال کی جھولی بنا، اور اس میں تین روپیہ اپنے پاس سے ڈال، چھتہ کی مسجد سے تن تنہا مولوی مہتاب علی صاحب مرحوم کے پاس تشریف لائے۔ مولوی صاحب نے کمال کشادہ پیشانی سے چھ روپے عنایت کئے، اور دعا کی، اور بارہ روپیہ مولوی فضل الرحمٰن صاحب نے اور چھ روپے اس مسکین (یعنی سوانح مخطوطہ کے مصنف منشی فضل حق صاحب دیوبندی) نے دیئے۔ وہاں سے اٹھ کر مولوی ذوالفقار علی صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کے پاس آئے۔ مولوی صاحب ماشاءاللہ علم دوست ہیں، فوراً بارہ روپے دیئے، اور حسن اتفاق سے اس وقت سید ذوالفقار علی[1] ثانی دیوبندی وہاں موجود تھے، ان کی طرف سے بھی بارہ روپے عنایت کئے،

---

[1] مدرسہ کی تاریخ میں مالی امداد کے ساتھ پہلی دفعہ پیش قدمی کرنے والوں کی اس تاریخی فہرست میں جن جن بزرگوں کے گرامی اسماء درج ہیں، ہماری کتاب کے پڑھنے والے عموماً ان سے روشناس ہوچکے ہیں۔ مولانا مہتاب علی صاحب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے تایا تو وہی بزرگ ہیں، جن کے مہتابی مکتب دیوبند میں سیدنا الامام الکبیر نے عربی شروع کی تھی۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب اور مولانا ذوالفقار علی صاحب کے علاوہ مصنف سوانح مخطوطہ کے حال سے بھی آپ آگاہ ہوچکے ہیں۔ البتہ ڈپٹی ذوالفقار علی صاحب دیوبندی سو مولانا محمد طیب صاحب کی یہ اطلاع ہے کہ دیوبند کے مشاہیر میں ان کا شمار تھا۔ قلعہ پر ان کی شاندار حویلی اب تک موجود ہے، جس میں اب اسلامیہ ہائی اسکول کھول دیا گیا ہے۔ لاہور کا سب سے پہلا نسوانی مجلہ "تہذیب النسوان" ڈپٹی ذوالفقار علی صاحب کے بڑے صاحبزادے مولوی ممتاز علی کی نگرانی میں شائع ہوتا تھا مولوی ممتاز علی صاحب نے قرآنی مضامین کی تبویب کرکے چار جلدوں میں "البیان فی مقاصد القرآن" کے نام سے شائع کی تھی۔ عہد جدید کے ممتاز انشاء پردازوں میں مولوی ممتاز علی کے صاحبزادے منشی امتیاز علی تاج ہیں۔ ۱۲

وہاں سے اٹھ کر یہ درویش بادشاہ صفت (یعنی حاجی محمد عابد صاحب) محلہ

ابوالبرکات میں پہنچے"

آگے کے الفاظ مخطوطہ مسودہ میں کچھ کٹ گئے ہیں، جو صاف طور پر پڑھے نہیں گئے، بظاہر کچھ ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ محلہ کی اس مسجد میں بیٹھ کر حاجی عابد صاحب مرحوم نے چندے کی اپیل شروع کی، الفاظ اس کے بعد جو پڑھے جاتے ہیں وہ یہ ہیں،

"دو سو روپے جمع ہو گئے، اور شام تک تین سو روپے۔ پھر تو رفتہ رفتہ خوب چرچا ہوا، اور جو پھل پھول اس کو لگے وہ ظاہر ہیں"

ابتدائی چندے کی اس لطیف سرگذشت کو درج کرنے کے بعد مصنف نے لکھا ہے کہ

"یہ قصہ بروز جمعہ دوم ماہ ذی قعدہ سنہ ۱۲۸۲ھ میں ہوا"

ذی قعدہ کے بعد سنہ ۱۲۸۲ ہجری کا ایک ہی مہینہ ذی الحجہ کا باقی تھا، ان ہی دو مہینوں میں کوشش کی گئی اور اتنا سرمایہ فراہم ہو گیا، کہ مدرسہ کھول دیا جائے، اور اسی مبارک تاریخی فیصلہ کے مطابق ان ہی کا بیان ہے کہ

"اور مدرسہ ۱۵ محرم سنہ ۱۲۸۳ھ میں جاری ہوا"

سن عیسوی کے حساب سے سنہ ۱۸۶۶ء ماہ اپریل کی غالباً ۱۴ تاریخ ہوگی۔ گویا بہار کا موسم ختم ہو رہا تھا، لیکن ختم ہوا نہیں تھا، اور دیوبند کے علاقہ میں آموں کا موسم شاید شروع ہو چکا تھا، یا شروع ہونے والا ہی تھا۔

غرض سیدنا الامام الکبیر کی "تاذین عام" اور آخرین میرٹھ والی "تاذین خاص" کے مقابلہ میں لبیک کا پہلا جواب سرزمین دیوبند سے جو بلند ہوا، اور ان ہی کے منشا کے مطابق مجوزین کرام نے نئے محاذ کا اس تعلیمی قالب کو دیوبند ہی میں قائم کرنے کی صورت پیدا کر کے جو مدرسہ کو کھول دیا، تو واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ کے لحاظ سے ان بزرگوں نے بڑا بھاری کام انجام دیا۔ حضرت شیخ الہند" کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحب کے قلم سے نکلے ہوئے عربی الفاظ میں دیوبند کے مدرسہ کے

کے افتتاح اور اس وقت کے ماحول کا ذکر ان الفاظ میں پایا جاتا ہے۔

وان لم یساعدہ الزمان والمکان ولم یوافقہ الحلین والاوان	اگرچہ اس مدرسہ کے قیام کے لئے نہ زمانہ کے حالات ہی سازگار تھے، اور نہ وہ جگہ جہاں مدرسہ قائم ہوا، اس کا ماحول ہی مناسب تھا۔

الغرض وقت بالکل ناموافق تھا۔

ایسی صورت میں اس کام کو اٹھانے والے، اس کی تحریک کو قبول کر کے اسے عملی شکل میں لانے والے، مالی امداد میں پیش قدمی کرنے والے، الغرض اس راہ میں دامے، درمے، قدمے، سخنے، جس منزل میں بھی جن سے کچھ بن پڑا، حد سے زیادہ ناموافق حالات میں گزرنے والے سچ تو یہ ہے کہ اس سنت حسنہ کی راہ کھولنے میں جو بھی جس منزل میں بھی شریک ہوئے وہ صرف اپنے ہی عمل کی حد تک نہیں، بلکہ "دارالعلوم دیوبند" کے وجود کے سارے ثمرات و نتائج جو اس وقت تک سامنے آ چکے ہیں، اور آئندہ جب تک خدا کی مرضی ہو، سامنے آتے رہیں گے۔ ہر ایک میں ان کے اجر وصلہ کا حق نبوی وثیقہ کی بناء پر وہاں محفوظ ہو چکا ہے، جہاں وہ پہنچ چکے ہیں، اور میں تو دیکھ رہا ہوں کہ اس دنیا میں بھی دارالعلوم ان "آباء صالحین" کے "ابناء صالحین" کی فلاح میں کافی معاون ثابت ہوا ہے۔ آج ان اسلاف کا وجود ان کے اخلاف کے لئے سرمایۂ ناز و افتخار ہے۔[1]

[1] چھتہ کی مسجد کے مجلس انس کے یہی تین اساطین جنہوں نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ کے "ذہن" کو سب سے پہلے عملی صورت دی اور جن کا ذکر حضرت مصنف امام نے مجوزین کے نام سے کیا ہے، یعنی حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب اور حضرت حاجی محمد عابد صاحب نور اللہ مرقدہم ان ہی کو دیکھئے۔ مولانا فضل الرحمن صاحب کی براہ راست اولاد میں حضرت اقدس مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب، حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب حضرت مولانا شبیر احمد صاحب رحمہم اللہ اپنے اپنے وقت میں علم و دین کے افق پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اسی زمانہ میں مولانا مطلوب الرحمن صاحب مد فیوضہم جو ان ہی مولانا فضل الرحمن صاحبؒ کے صاحبزادے ہیں مسلمانوں کی دینی اور روحانی تربیت جس وسیع پیمانہ پر کر رہے ہیں یقیناً اس کو بھی دارالعلوم ہی کے فیوض و برکات میں شمار کرنا چاہئے۔ اسی طرح حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب کے صاحبزادے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ تو ہند کے شیخ الکل ہی بن کر رہے، اور یہ بھی کیا، کون گن سکتا ہے کہ آپ کے تلامذہ اور شاگرد (باقی اگلے صفحہ پر)

بانی دارالعلوم کی تاسیس و آغاز کے سلسلہ کی "حکایت لذیذ" یعنی قصہ "انار و محمود" یہ عجیب بات
ہے کہ سوانح مخطوطہ نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے، مگر ان الفاظ کے ساتھ

و اسنہ معنوی سے) ایشیا و افریقہ کے کن کن علاقوں میں پھیلے ہوئے علم و دین کی خدمت میں مصروف رہے اور ہیں،
علمی اور دینی پہلوؤں کے سوا ملک کے سیاسی انقلاب میں آپ کا جو حصہ ہے، کیا اس کا کوئی انکار کرسکتا ہے؟ یقیناً
آج جن قربانیوں، جاں فروشیوں کی قیمت ملک کی آزادی کی شکل میں ہمارے سامنے آئی ہے، کیا یہ واقعہ نہیں ہے
کہ اس قیمت میں کافی اور معقول سرمایہ شیخ الہند کی غیر معمولی اور اولوالعزمانہ قربانیوں کا بھی شریک ہے۔ حضرت
شیخ الہند کے حقیقی بھائی مولانا حکیم محمد حسن رحمہ اللہ کی پوری زندگی دارالعلوم کی علمی خدمات کے ساتھ اس ...
کے شعبۂ طب کی ہمہ وقت خدمت میں صرف ہوئی اور اساتذۂ دارالعلوم میں اپنی خصوصیات کے ساتھ علمی میدان
میں ان کی شخصیت نمایاں رہی۔ شیخ الہند کے داماد مولانا قاضی مسعود احمد صاحب کو آج دارالعلوم کے شعبۂ افتاء کی
خدمات میں زندگی کھپا دینے کی توفیق ملی ہوئی ہے۔ مجلس انس کے تیسرے اور نمایاں رکن جن کی عقیدت و عظمت کے
سامنے سابقہ ہر دو رکن بھی جھکے ہوئے تھے، یعنی حضرت اقدس حاجی سید محمد عابد صاحب قدس سرہ کے متعلق
بھی کیا کم ہے کہ مرکزی جمعیۃ العلماء ہند کے ناظم مولانا سید محمد میاں صاحب سلمہٗ دیوبند کے اسی خانوادۂ سادات کے
چشم و چراغ ہیں جس کے ایک رکن حضرت حاجی صاحبؒ بھی تھے۔ اپنے اس تعلق کا اظہار مولانا موصوف نے اپنی
مشہور کتاب "علماء ہند کا شاندار ماضی" میں فرمایا ہے۔

علاوہ براہ راست اولاد کے ان حضرات کے احفاد و اسباط کو دارالعلوم کی برکات ظاہری و باطنی سے مستفید
ہونے کے جو مواقع میسر آئے، ان کی فہرست بھی کافی طویل ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے پوتے یعنی
حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کے صاحبزادے مولانا عتیق الرحمٰن صاحب ادارہ "ندوۃ المصنفین" اور مجلہ "برہان"
کے ذریعہ جن علمی مہمات کو انجام دے رہے ہیں، وہ ہم سب کے سامنے ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی قاری حافظ
جلیل الرحمٰن صاحب دارالعلوم کے شعبۂ تجوید کی قابل قدر خدمات انجام دینے میں مصروف ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ
کے نواسے مولانا محمد عثمان صاحب دارالعلوم کی تدریس کے ساتھ ملک کی سیاسی خدمات اور شہری معاملات کی تنظیم کے
سلسلہ میں کافی متعارف ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ کے دوسرے نواسے یعنی مولانا قاضی مسعود احمد صاحب کے
صاحبزادے مولوی محمد ہارون صاحب بھی دارالعلوم دیوبند کے دائرۂ تدریس ہی میں کام کر رہے ہیں، اور انہیں علمی لائن
کی خدمات کی اہلیت نصیب ہوئی ہے، اور پھر ان تمام علمی قالبوں کی روح رواں یعنی حضرت اقدس مولانا نانوتوی قدس
اللہ سرہ جن کے فلک رس جذبات آتش دان سے نکل نکل کر یہ گرمی اس سارے ماحول کو تپائے ہوئے تھی،
الحمد للہ کہ یہ تپش اپنے کام میں مصروف ہے، ان کی روحانی اور معنوی ذریت کے ساتھ جو پورے عالم اسلام میں
پھیلی ہوئی ہے۔ ان کے نسبی سبط کو دیکھا جائے تو براہ راست ان کے خلف اکبر حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب
رحمہ اللہ مہتمم دارالعلوم دیوبند سے جو پھل پھول اس چمنستان قاسمیؒ کو لگے آج ان کا کون انکار کرسکتا ہے (باقی اگلے صفحہ پر

یہ بشارت بھی پہنچائی گئی، کہ ان کے حسب منشاء دیوبند والوں نے دینی تعلیم کے اجتماعی نظام کی قسم میں سبقت کی مدرسہ کی مجلس شوریٰ کے ایک رکن وہ بھی قرار دیئے گئے ، ۱۲۸۳ھ جس میں مدرسہ قائم ہوا۔ اس کی روداد سے نقل کر چکا ہوں کہ طلبہ کے امتحان لینے والوں میں بھی دوسروں کے ساتھ آپ کا ذکر بھی خاص طور پر کیا گیا ہے، چندہ دہندوں کی فہرست میں آپ کے اسم گرامی کے آگے (ر) رقم درج ہے، جو آخر وقت تک جاری رہی۔ اتنی بات تو یقینی ہے، کہ حاجی سید محمد عابد صاحب مرحوم کے بشارت نامہ میں دیوبند تشریف آوری کی دعوت آپ کو جو دی گئی تھی، اس وقت یہ دعوت دعوت ہی بن کر رہ گئی۔ صحیح طور پر یہ بتانا دشوار ہے کہ یہ صورت حال کب تک قائم رہی، بس مصنف امام ہی یکایک یہ اطلاع دیتے ہیں کہ

"مولوی محمد قاسم صاحب شروع مدرسہ میں دیوبند آئے، اور پھر ہر طرح اس مدرسہ کے سرپرست ہو گئے" ص۲۱

میرٹھ سے دیوبند حضرت والا کی یہ تاریخی تشریف آوری جس کے بعد بقول مصنف امام "ہر طرح" اور "ہر پہلو" کے لحاظ سے آپ مدرسہ کے سرپرست ہو گئے۔ کچھ اتنے دبے پاؤں، خاموشی کے ساتھ ہوئی، کہ تلاش کے باوجود اس کی چونکہ صحیح تاریخ معین نہ ہو سکی، اس لئے یہ بتانا بھی سخت دشوار ہے کہ قیام مدرسہ اور "ہر طرح سرپرست" بن جانے والی اس تشریف آوری کی درمیانی مدت کا وقفہ کتنے دنوں پر مشتمل ہے، ایک مطبوعہ حمائل شریف جو حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس ترجمہ کے ساتھ مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوا ہے۔ شاید کہیں پہلے بھی اس کا ذکر گذرا ہے، اس حمائل میں بجائے عام دستور کے ترجمہ زیر سطور نہیں بلکہ ہر صفحہ کی آیتوں کا ترجمہ نمبر لگا کر حاشیہ پر چھاپا گیا ہے، شاید اب بھی ملتا ہو، اس حمائل کے آخر میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ ابتداءً یہ نسخہ خاص طریقہ سے میرٹھ کے مطبع مجتبائی سے ۱۲۸۶ھ میں شائع ہوا تھا[1]۔ اسی سلسلہ میں

[1] اسی حمائل کے طبع کی تاریخ بھی سیدنا الامام الکبیر کی نکالی ہوئی "اما لا مثل لہ ولا امثال" کا ذکر بھی کیا ہے اس سے بھی ۱۲۸۶ھ کے اعداد نکلتے ہیں، اگرچہ ہے تو یہ ایک تاریخی مادہ اور "لیس کمثلہ شیئ" (باقی اگلے صفحہ پر)

یہ اطلاع بھی درج کی گئی ہے کہ میرٹھ کے مطبع مجتبائی میں شائع ہونے والی اس حمائل کی

"قاسم الخیرات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رح بانی مدرسہ دیوبند نے اس کی تصحیح فرمائی"۔

اس کا اقتضاء بہر حال اتنا ضرور ہے کہ ۱۲۸۳ھ جس میں دیوبند کا مدرسہ قائم ہوا، اس کے تین سال بعد یعنی ۱۲۸۶ھ تک میرٹھ کے مطبع مجتبائی میں چھپنے والی کتابوں کی تصحیح کا کام سیدنا الامام الکبیر انجام دیتے رہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس کے لئے براہ راست میرٹھ میں قیام ضروری نہیں۔ اور تین سال تک اگر اسی بناء پر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ میرٹھ ہی میں آپ کا قیام رہا، تو مصنف امام کی اطلاع میں

"شروع مدرسہ میں دیوبند آئے"۔

اس میں "شروع" کے لفظ کی پھر کیا توجیہ کی جائے گی؟ کیا تین سال کے بعد تشریف آوری کے واقعہ کی تعبیر "شروع مدرسہ" کے لفظ سے کسی حیثیت سے صحیح ہو سکتی ہے؟

بمشکل ہم اگر کچھ کہہ سکتے ہیں تو وہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا کہ "لفظ شروع" سے حقیقی آغاز وابتداء مدرسہ تو ہم مراد ہی نہیں لے سکتے، کہ یہ واقعہ کے خلاف ہے، اور تین سال کے وقفہ کی بھی گنجائش "شروع" کے لفظ میں نہیں، کچھ اوسط ہی نکالنا پڑے، لیکن وہ اوسط بھی کیا ہو؟ اور تو کوئی بات ملی نہیں، البتہ ۱۲۸۴ھ جو قیام مدرسہ کا دوسرا سال ہے، اس کی جو روداد شائع ہوئی ہے، اس میں یہ خبر دیتے ہوئے کہ مدرسہ کی

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ) کے کلام کی تاریخ کے لئے موزون ترین مادہ تاریخ یہ ہو سکتا ہے۔ لیکن یوں بھی جب ہم غور کرتے ہیں، کہ قرآن جو سورتوں اور پاروں کے ساتھ ساتھ رکوعوں میں تقسیم شدہ ہے، لیکن ہندوستان کے شائع شدہ قرآنی نسخوں میں ہر رکوع کے آیات پر نمبر اندازی کا رواج نہیں تھا۔ غالباً سیدنا الامام الکبیر کی یہ جدت طرازی تھی کہ ہر صفحہ کی آیتوں پر آپ نے نمبر لگائے، اور ان ہی نمبروں کے حساب سے حاشیہ پر ہر آیت کا اردو ترجمہ اس طرح سے درج ہو گیا ہے کہ سابقہ و لاحقہ آیتوں کے ترجمہ سے کسی قسم کا اشتباہ ان لوگوں کے لئے بھی باقی نہیں رہتا، جو براہ راست قرآن کی عربی عبارت سمجھنے سے معذور ہیں۔ زیر سطری ترجموں میں اگلی اور پچھلی آیتوں کے ترجموں کے الفاظ میں ان غریبوں کو جو دشواری قدرتاً پیش آتی ہے۔ نمبر اندازی کی اس تدبیر سے یہ دقت رفع ہو جاتی ہے، سچ پوچھئے تو اس لحاظ سے یہ اچھوتا کام تھا جس کی تقلید نہیں کی گئی ۱۲

عمر کے اسی دوسرے سال میں

"ایسا امر عظیم اور حادثہ فخیم پیش آیا کہ جس سے تمام اہل دیوبند اور جملہ مدرسین و طلبہ کو گمان

غالب تھا کہ اب قائم رہنا اس مدرسہ کا مشکل ہے"۔

آگے اسی "امر عظیم" اور "حادثہ فخیم" کی تفصیل یہ درج کی گئی ہے کہ

"حاجی عابد حسین صاحب جو مہتمم مدرسہ، بلکہ اصل اصول اس کام کے تھے، اور باشندگان

دیوبند و اطراف و جوانب کے دلوں میں ان کی عظمت و توقیر بدرجۂ کمال تھی۔ ان کے لحاظ و

پاس سے بہت سے طلبہ بیرونجات کے واسطے کھانا مقرر ہوا، اور چندہ بھی بہت آب و

تاب سے تحصیل ہوا۔ یکایک عزم بیت اللہ کا کیا، اور قطع تعلق سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ

پھر ہندوستان تشریف نہ لائیں گے"۔

ایک ایسے الہامی کام کو شروع کرکے اچانک حاجی صاحب قبلہ کا یہ تکوینی طرز عمل اور انقلابی اقدام اس کے ظاہری و معنوی اسباب کیا تھے؟ اس کا جواب کچھ نہیں دے سکتے، اب خواہ اسباب کچھ بھی ہوں، اسی روداد میں لکھا ہے کہ حاجی صاحب کے اس فیصلہ نے دلوں میں یہ اندیشہ پیدا کر دیا کہ

"بنیاد مدرسہ از بیخ کندہ ہو جاتی تو عجب نہ تھا"۔

بایں ہمہ معلوم یہی ہوتا ہے کہ حاجی صاحب اپنے فیصلہ پر قائم رہے، اور جس مدرسہ کی باگ الہام کے زیر اثر جیسا کہ کہا جاتا ہے، انہوں نے اپنے ہاتھوں میں لیا، اس کے "از بیخ کندہ" ہو جانے کے نتیجہ سے بے پروا ہو کر ہی گذرے جس کا انہوں نے ارادہ کیا تھا، اور شاید یہی مطلب ہے ان لوگوں کا جو کہتے ہیں کہ دیوبند کا مدرسہ جس پیمانہ پر بھی شروع میں قائم ہوا تھا، حج کو چلے جانے کے اس ارادہ کے بعد ہی کم از کم اپنی ذات کی حد تک حاجی عابد حسین صاحب نے صرف یہی نہیں کہ اس مدرسہ کو ختم ہی کر دیا تھا بلکہ روداد ہی میں جو یہ لکھا ہے کہ

"قطع تعلق سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ پھر ہندوستان تشریف نہ لائینگے"۔

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اپنے طرز عمل سے مستقبل میں بھی لوگوں کو اس مدرسہ کی جانب سے مایوس

بینا چکے تھے، لیکن واقع میں یہ مدرسہ جس کا تھا، اور جو پیدا ہی کیا گیا تھا اس مدرسہ کے لئے، مدرسہ کے ختم ہونے کا بھی خطرہ یا حادثہ اسی حقیقت اور واقعہ کے ظہور کا ذریعہ بن گیا، اور اب اسی مسئلہ پر میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

مدرسہ میں مستقل قیام

اب تک جو کچھ بیان کیا جا چکا ہے، اس سے بہرحال اتنی بات عیاں ہو چکی کہ دیوبند میں مدرسہ عربی سیدنا الامام الکبیر کی چشم و ابرو کے اشاروں بلکہ صریح اذن اور عملی پیش قدمی کا رہین منت تھا۔ ۵۷ء کی ناکامی کے بعد اس "نئے محاذ" یا گھات کی "نئی کمین گاہ" کے کھولنے میں پیش قدمی بھی ان ہی کے کچھار کے پروردہ شیر بچوں کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی، اور فراہمی چندہ کے بشارت نامہ ہی میں آپ کو دعوت بھی دی گئی کہ براہ راست اپنے ہاتھ سے تعلیم کا افتتاح یا مدرسہ کا اجراء کریں۔ اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ قیام مدرسہ سے پہلے بھی، اور قیام مدرسہ کے بعد بھی روح اور قلب تو دیوبند ہی میں، لیکن جسم کہئے یا قالب جس پر دیکھنے والوں کی نظر پڑ سکتی تھی، کچھ خاص اسی موقعہ پر نہیں بلکہ اپنی فطری عادت اور دوامی وطیرے کے مطابق آج بھی نگاہوں سے وہ مخفی تھا۔ مگر عوام نہ سہی، خواص کی آنکھوں سے بھی دیوبند کے مدرسہ سے آپ کا واقعی تعلق کیا مخفی تھا، یا مخفی رہ سکتا تھا۔ مخلصانہ سہی، لیکن چھتہ کی مسجد کی "محفل" میں جو کچھ ہوتا تھا، وہ راز بن کر رہتا تھا، آخر میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں، دیوبند، جو عرض کر چکا ہوں، ضلع سہارنپور کے دوسرے مجہول الحال والاسم قصبات کے ساتھ ساتھ جس زمانہ میں دیوبند نہیں بلکہ عوام کا صرف دیبند تھا۔ اسی دور افتادہ مقام میں مدرسہ قائم ہوتا ہے، مانا کہ حاجی عابد حسین رحمۃ اللہ علیہ کو قصبہ اور اس کے گردونواح میں غیر معمولی ہردل عزیزی حاصل تھی، ان کا ان لوگوں پر کافی اثر و اقتدار بھی تھا، اسی لئے جیسا کہ روداد کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں، بیرونجات کے طلبہ کے قیام و طعام کے نظم میں سہولتیں بھی ہوئیں۔ یوں بھی "طلبہ نوازی" مسلمانوں کا موروثی ذوق تھا، اس زمانہ میں بھی اور اس سے پہلے بھی میں تو یہی جانتا ہوں کہ شہروں اور قصبوں ہی کی حد تک نہیں، بلکہ دیہاتوں تک میں بسنے والے

مسلمانوں کے یہاں "طالب علم کی جاگیر" ہندوستان کے ارباب ہمت و ثروت کے لوازم زندگی میں داخل تھی لیکن اسی کے ساتھ آپ آئندہ سالوں کی نہیں، بلکہ دیوبند کے اس "مدرسہ عربی" کے پہلے سال کی مطبوعہ روداد اٹھا لیجئے۔ اس کے ابتدائی اوراق میں آپ کو بیرونجات کے طلبہ کے متعلق یہ خبر بھی ملے گی،

"فقط قصبات ضلع سہارنپور و اضلاع ممالک مغربی کے طلبہ ہی نہیں بلکہ

پنجاب و کابل و بنارس

تک کے لوگ جمع ہو گئے تھے"

جس کا مطلب یہی تو ہوا کہ مغرب میں پنجاب سے گذر کر کابل تک طلبہ کو دیوبند کا یہ مدرسہ دامن کشاں اپنے احاطہ میں لئے چلا آ رہا تھا، اور مشرق میں "بنارس" تک کے طلبہ پہلے ہی سال میں اس مدرسے کے طالب علم بن چکے تھے۔ بنارس کے نام کی تو روداد میں تصریح کی گئی ہے۔ طلبہ کے خانے پر میری نظر جب اسی روداد میں پڑی تو دوسرے ناموں کے ساتھ "مولوی بدر الدین عظیم آبادی" کا نام بھی دیکھا کہ پہلے سال کی اسی روداد میں شریک ہے، مولوی صاحب کی شخصیت سے تو واقف نہیں ہوں، لیکن "عظیم آبادی" کی نسبت بتا رہی ہے کہ بنارس سے آگے بڑھ کر عظیم آباد، پٹنہ (بہار) تک کے طلبہ اس مدرسہ کی آغوش تعلیم و تربیت میں اپنی جگہ بنا چکے تھے۔

اسی طرح مالی امداد کے سلسلہ میں ذرا ملاحظہ فرمایئے پہلے سال کی اسی روداد کا اور جائزہ لیجئے۔ ان ناموں اور مقاموں کا جن سے ضلع سہارنپور کی گمنام آبادی دیوبند میں چندے آنے لگے تھے میری آنکھیں تو پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب چندہ کے خانے میں ایک طرف راجپوتانہ کی پہاڑی ریاست ٹونک سے حکیم عبدالحمید نامی کے چندے کا اور دوسری طرف سینکڑوں میل دور داناپور (بہار) کے باشندوں کے نام سے بھی پچاس روپے کی رقم کا ذکر کیا گیا ہے۔ سوچتا ہوں تاریکی، دہشت و خوف کے ان بھیانک دنوں کو سوچتا ہوں، چند ہی سال تو گذرے تھے کہ ۱۸۵۷ء میں بزن و بکش، گیر و دار کے ہنگاموں سے ہندوستان کی زمین خصوصاً مسلمانوں کی آبادیاں کانپ رہی تھیں۔ اس خونی سمندر اور آتشیں دوزخ

میں تہ و بالا ہونے کا تماشہ جنھوں نے کیا تھا، ان کی آنکھوں کے سامنے سے تو یہ تماشہ ضرور ہٹ چکا تھا لیکن وہ مرے بھی تو نہ تھے۔ جو اپنے حافظے اور یادداشت کی قوتوں سے ان خونیں، جگر خراش، روح گسل مہیب و ہولناک، انسانیت سوز نظاروں کی یاد کو مٹانا بھی چاہتے تھے تو مٹا نہیں سکتے تھے۔ اپنے بزرگوں عزیزوں، جگر پاروں، دوستوں، ہمسایوں کی پھانسیوں پر لٹکی ہوئی لاشوں، اور ان پا بزنجیر دست بطوق سسکتے ہوئے جسموں کو بھولنا ہی چاہتے تھے جو ان ہی کے ساتھ جیل خانوں اور دریائے شور کے ویران جزیروں کو بھرنے کے لئے گھسیٹے جا رہے تھے، لیکن بھول نہیں سکتے ظلم و ستم کے اس طوفانی تلاطم میں گونہ سکون کی کیفیت تو دس سال کے اس عرصہ میں یہ واقعہ ہے کہ پیدا ہو چکی تھی۔ لیکن یہ تو جو کچھ تھا، باہر میں تھا، اندر میں تو اب بھی تہلکہ ہی برپا تھا، باطن تو اب بھی ان ستم دیدوں کا غیر مطمئن لرزاں و ترساں ہی تھا، پھر مراسلات و مواصلات کے ذرائع بھی اس وقت تک حد سے زیادہ ناکمل تھے، غلغلہ انگیزیوں اور شاخسانہ بازیوں کے عام ذرائع اخبار اور پریس کی قوت سے ملک اس وقت تک گویا کچھ ناآشنا ہی تھا ٹوٹے پھوٹے شکستہ در بودہ حال میں کچھ ماہوار یا ہفتہ وار اخبار نکلتے بھی تھے۔ یا گنتی کے چند مطابع ملک کے مختلف گوشوں میں جاری بھی ہوئے تھے۔ سو ۵۷ء کی افراتفری میں ان کا نظام بھی درہم برہم ہو چکا تھا۔ یہ اور اسی قسم کے وہ سارے اسباب و وسائل جن سے کسی چیز کے مشہور کرنے میں کام لیا جائے یا اس وقت جن سے لوگ کام لے رہے ہیں، اس زمانہ میں ہم ان کا شاید تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ پنجاب و کابل، راجپوتانہ، بہار، جو اس زمانے کے لحاظ سے یقیناً دیوبند کے لئے دور دست علاقے تھے۔ ان علاقوں سے طلبہ بھی، اور چندے بھی اس قصباتی مدرسہ میں قائم ہونے کے پہلے سال ہی سے کیسے اور کیوں آنے لگے تھے۔ کیا دیوبند کے مقامی بزرگوں کے وجود اور ان کے وجود کے اثر و اقتدار سے ہم اس کی من مانی نہیں، دل نشین اور واقعی صحیح منطقی توجیہ میں کامیاب ہو سکتے ہیں؟

وہی جس کا جسم دیوبند سے غائب تھا، لیکن روح اس کی ہمہ تن ابتدا ہی سے اس مدرسہ کی بنیاد میں جذب تھی، اس کے تعلق کے سوا کوئی صحیح جواب اس سوال کا دل کو یا دماغ کو مل سکتا ہے؟ اور سچ تو یہ ہے کہ مدرسہ کی پہلی مجلس شوریٰ کے ارکان اور مدرسہ کے پہلے امتحان تک کے کاموں میں روح کے ساتھ اسکے

جسم مبارک کو ہم جب حاضر ہی پاتے ہیں، تو قالب کی یہ مجازی غیر حاضری بھی مجازی ہونے کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتی ہے، جن کی نظر مجاز پر تھی، وہ نہ سہی، لیکن ملک کے طول و عرض میں حقیقت ناشناسوں کا طبقہ بھی تو تھا، مسلمانوں کے دینی تعلیم کے اس سب سے پہلے اجتماعی نظام کے عملی قالب "مدرسہ عربی دیوبند" سے سیدنا الامام الکبیر کا جو تعلق تھا، ان کی نگاہوں سے بھی کیا یہ تعلق اوجھل رہ سکتا تھا؟ "غیب" کے "لا یحتسبی" قوانین کے نتائج و آثار کا جنہیں تجربہ نہیں ہے، وہ یہی سمجھ سکتے ہیں کہ ظاہری اسباب کی رو سے بھی ضلع سہارنپور کی اس قصباتی آبادی میں قائم ہونے والے مدرسہ میں پنجاب و کابل، بنارس و عظیم آباد، ٹونک (راجپوتانہ) داناپور (بہار) سے طلبہ اور مالی امداد کے سلسلہ کا شروع ہو جانا محلِ حیرت و استعجاب نہیں ہو سکتا، واقعہ یہ ہے کہ دیوبند و اطراف دیوبند کی آبادیوں پر حاجی عابد حسین صاحب کا جو اثر و اقتدار تھا، سیدنا الامام الکبیر کی اس زمانہ تک تقریباً سارے ہندوستان کی اسلامی آبادیوں سے یہی نسبت قائم ہو چکی تھی، اور شاید یہی وجہ ہوئی کہ دیوبند کے جس مقامی مدرسہ کے لئے ہندگیر کیا سارے اسلامی ممالک کا "عالمگیر جامعہ" بن جانا مقدر ہو چکا تھا، اسی تقدیر کو تدبیر کے قالب میں لانے کیلئے کہ ایک طرف بظاہر شر کی صورت میں یہ حادثہ پیش آیا کہ از بیخ کندہ ہو جانے کا خطرہ حاجی عابد حسین صاحب کے قطع تعلق کی وجہ سے مدرسہ کے لئے پیش آیا، اور دوسری طرف جیسا کہ اسی روداد میں لکھا ہے کہ

"باشندگان دیوبند میں بظاہر ایسا کوئی نظر نہ آتا تھا کہ اس کام کا متکفل ہوتا"

یہ صورت حال ہی ایسی تھی کہ مجاز کا جو پردہ حائل تھا، وہ بھی سامنے سے ہٹ جائے اور وہ ہٹ گیا، قطب کے ساتھ ساتھ قالب بھی اس کا دیوبند ہی پہنچ گیا، جسے ابتداء قیام مدرسہ کے وقت تاریخ کی آنکھیں ڈھونڈھ رہی ہیں۔ اور تھک تھک کر واپس ہوتی ہیں کہ آخر جس کا یہ مدرسہ تھا اور جو اس مدرسہ کے لئے تھا، وہی آج کیوں غائب ہے؟

صحیح تاریخ متعین ہو سکتی ہو، یا نہ ہو سکتی ہو، اور جس شخص کی ولادت کی تاریخ تو تاریخ مہینے تک کو اس کی طفولیت و شباب و کہولت کے رفیق ہمارے مصنف امام تک متعین کرنے سے اپنے آپ کو قاصر و معذور بتا رہے ہوں تو ایسی عجیب و غریب شخصیت کے متعلق دارالعلوم کی دوامی خدمت کیلئے

دیوبند میں مستقل قیام کی تاریخ ہم جیسے دور افتادوں کے لئے کچھ مبہم ہو کر اگر رہ جائے تو اس پر تعجب کیوں کیجئے۔ زیادہ سے زیادہ بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ مدرسہ کے کاروبار کا جو متکفل ہو، جب دیوبند میں کوئی ایسی ہستی بظاہر باقی نہ رہی، یا نظر نہ آئی، تب لانے پر دیوبند والے اور آنے پر سیدنا الامام الکبیر بھی مجبور ہو گئے۔

اسی کے بعد مدرسہ سے آپ کا وہ عجیب و غریب با ہمہ و بے ہمہ رشتہ نفس واپسیں تک قائم رہا کہ ایک طرف مصنف امام تو سیدنا الامام الکبیر کے بارہ میں یہ فرماتے ہیں کہ

"ہر طرح اس مدرسہ کے سرپرست ہو گئے۔"

اور دوسری طرف سنانے والے مسلسل یہی سناتے چلے آ رہے ہیں کہ

"دارالعلوم دیوبند میں مولنا محمد قاسم نے نہ درس دیا، اور نہ اس کے اہتمامی وانتظامی شعبوں سے بظاہر بحیثیت عہدہ کے کسی قسم کا کوئی تعلق آپ کا کبھی قائم ہوا۔"

"با ہمہ اور بے ہمہ" کا یہ حیرت انگیز رشتہ اس لئے بھی عجیب تھا کہ "ہر طرح سرپرست" بن جانے کے بعد یہ واقعہ ہے کہ آپ دارالعلوم تھے اور دارالعلوم آپ ہی کا وجود با جود تھا، لیکن مجھ ہی سے آپ سن چکے کہ مدرسہ کی دوات کی سیاہی کے ایک قطرہ کا بھی بلا معاوضہ صرف کرنا، نفقاً اسی کو اپنے لئے کبھی آپ نے جائز نہیں قرار دیا جس میں سیاہی کے چند قطرات ہی سہی، کچھ خرچ تو ہوتا تھا، بلکہ اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ "سرد خانہ" سے صفاتی استفادہ جس سے نہ سرد خانے کی ذات میں کوئی کمی پیدا ہوتی تھی، اور نہ صفات میں اس استفادہ کا بھی حقدار اپنے آپ کو نہیں خیال کیا، اور شدید طبعی حرارت مزاج کے باوجود موسم گرما کی تپش اور لو کی تکلیف کے برداشت کرنے ہی کو اپنی دلی راحت کی ضمانت ٹھہراتے رہے۔ قدس اللہ سرہ ونفعنا اللہ بمآثرہ الطیبہ الطاهرة النزهة الباهرة۔

بہر حال میرٹھ میں قیام مدرسہ کے بعد آپ جتنے دنوں بھی رہے ہوں، لیکن مصنف امام کے بیان کی مطابق اتنا ماننے پر بہر کیف ہم مجبور ہیں کہ

"شروع مدرسہ میں آپ دیوبند رہے اور ہر طرح اس مدرسہ کے سرپرست ہو گئے۔"

بہ "شروع" کے لفظ کو سامنے رکھتے ہوئے "قالب" کی دوری کے ان دنوں کی نوعیت جتنی بھی جی چاہی

متعین کر لیجئے، ان دنوں میں مدرسہ میں کیا کیا ہوا، ہندوستان کے عربی، دینی تعلیم کے قدیم نظام
کے مقابلہ میں، دیوبندی سلسلہ کے اس جدید نظام میں جن امتیازی خصوصیات کو ہم پاتے ہیں، ان
میں کتنی باتوں کا اضافہ سیدنا الامام الکبیر کی مستقل تشریف آوری اور ہر طرح سرپرست بن جانے کے بعد
اس مدرسہ میں ہوا، ان امور کی تفصیل جیسا کہ کہتا چلا آ رہا ہوں، دارالعلوم کی تاریخ لکھنے والوں کا علمی
فریضہ ہے۔ بالکل ممکن ہے کہ جماعت بندی، رجسٹر حاضری، امتحان تحریری جیسی باتیں جن سے حکومت
قائمہ کے نئے نظام تعلیم نے ملک کو روشناس کیا تھا، شروع ہی سے ان کی افادیت اور ضرورت کو
محسوس کر کے قبول کر لیا گیا ہو، آخر حاجی سید عابد حسین صاحب مرحوم جن کے ہاتھ میں مدرسہ کے اہتمام
وانتظام کی باگ ابتدا میں سپرد کی گئی تھی۔ وہ اجتماعی تعلیم کے ان عصری لوازم وخصوصیات سے ناآ کر
کوئی تعلق نہ رکھتے ہوں، لیکن مولنا فضل الرحمٰن اور مولنا ذوالفقار علی طاب ثراہما کی تو عمر ہی ان چیزوں
کے عملی تجربوں کی دشت نمائی میں گذری تھی، طالب علمی کے زمانہ میں بھی، اور ملازمت کے ایام میں بھی،
دونوں دلی عربک کالج کے صدر مولنا مملوک علی سے تلمذ کا تعلق رکھتے تھے، اور حکومت کے محکمۂ
تعلیمات میں منسلک ہو کر ڈپٹی انسپکٹر کے عہدوں تک پہنچے تھے۔ ان نئے اصلاحات کے لئے ان ہی
دونوں بزرگوں کا وجود کافی تھا، پھر سیدنا الامام الکبیر بھی سکانی بُعد کے باوجود حقیقۃً اس مدرسہ سے
جتنے قریب تھے، ان کے مشوروں سے بھی اثر پذیر ہونے کی راہیں اس زمانہ میں بھی کھلی ہوئی تھیں۔ لیکن
براہ راست حضرت والا کا قیام چونکہ مدرسہ میں ابھی نہیں ہوا تھا، اس لئے وقفہ کی اس مدت کے متعلق
جو کچھ بھی عرض کیا گیا، اپنی بحث کے حقیقی دائرہ سے تجاوز کے بعد ہی عرض کیا گیا، لیکن میرٹھ چھوڑ کر دیوبند
میں مستقل قیام کا فیصلہ کرنے کے بعد جب مدرسہ کے کاموں سے آپ کا وہ عجیب وغریب اچھوتا
انوکھا رشتہ "باہمہ اور بے ہمہ" والا قائم ہوا، یعنی سب کچھ ہونے کے باوجود دیکھنے والے یہ بھی دیکھ رہے
تھے، "کہ آپ کچھ نہیں" ہیں۔ اس "عہد" کے متعلق مجھے اعتراف کرنا چاہئے، کہ جن جن سوالوں کے
جوابوں سے واقف ہونے کی ضرورت ہے، اور اس سلسلہ میں جس نوعیت کی "معلومات" کو دل ڈھونڈھتا
ہے، جیسا کہ چاہئے، ان کی فراہمی میں تو کامیاب نہ ہو سکا، تاہم تلاش وجستجو سے اب تک جن اموریک

بعض ممتاز اور سربرآوردہ مسلمان شریک ہوئی تھیں۔ علیگڑھ کالج جو اب مسلم یونیورسٹی بن چکا ہے، اس کی طرف سے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم گویا نمائندہ بن کر اس جلسہ میں تشریف فرما ہوئے تھے۔ اس وقت پھر وہی "قدیم و جدید علوم کے پیوند" کا مسئلہ چھڑا، اور چاہا گیا کہ سیدنا الامام الکبیر کے نصب العین کے بالکل برعکس ترتیب ہی کا اس سلسلہ میں تجربہ کیا جائے۔ یعنی جدید علوم و فنون کے گریجویٹوں کو دارالعلوم دیوبند میں داخل کر کے اسلامی علوم و فنون کی تعلیم سے استفادہ کا موقعہ دیا جائے۔ تجویز پاس بھی ہوئی، اور اس کے مطابق علیگڑھ کالج کے گریجویٹ دیوبند کے مدرسہ میں آکر شریک بھی ہوئے لیکن نتیجہ اس کا کیا ہوا، ناظم جمعیت العلماء مولانا سید محمد میاں صاحب اپنی کتاب "علماء ہند کا شاندار ماضی" میں یہ لکھتے ہوئے، کہ

"اس کا یعنی اس تعلیمی ترتیب کا ثمرہ نہایت تلخ تھا"

آگے وہی اطلاع دیتے ہیں کہ

"پہلی مرتبہ جو علیگڑھ سے سند حاصل کرنے کے لئے آئے وہ انگریز کے سی۔ آئی۔ ڈی تھے جنہوں نے حضرت شیخ الہند کو گرفتار کرانے میں دشمن دوستی اور قوم پروری کا حق ادا کر کے انگریز بہادر سے سپرنٹنڈنٹ سی۔ آئی۔ ڈی کا عہدہ حاصل کیا" ص۱۱ حصہ پنجم

اب جب کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بھی زندان خاکی سے آزاد ہو کر اپنے سلف صالحین تک عزیز مقتدر کے مقعد صدق میں پہنچ چکے، اور ان کا دشمن انگریز بھی ملک کو خالی کر کے جا چکا۔ اس "ثمرہ تلخ" کی اجمالی خبر کی تفصیل فضول ہے۔ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا، اور میں نہیں سمجھتا کہ جس تلخی کا تجربہ ہوا، سیدنا الامام الکبیر کے نصب العین کے معکوس ترتیب کا تجربہ آخر اس کے سوا کس ثمرہ کو پیدا کرتا، انسانی جبلت کا یہ فطری قانون ہے کہ خام عمری میں جس رنگ کو بھی پختہ کر دیا جائے، وہی پختہ ہو جاتا ہے۔ پختہ رنگ کا ازالہ کر کے نئے رنگ کا چڑھانا آسان نہیں ہے۔ سیدنا الامام الکبیر کی حکیمانہ بصیرت نفسیات انسانی کے اس راز کو تجربے سے پہلے اگر نہ پالیتی تو اور کون پاتا۔

باقی میں نے افواہاً یہ بھی سنا ہے، اور مولانا سید محمد میاں نے بھی لکھا ہے کہ معکوس ترتیب کے

اس نبوی سرمایہ سے بے نیاز اور مستغنی ہو چکے ہیں۔ مشہور حدیث جس میں پیشگوئی کی گئی ہے کہ وقت ایسا بھی مسلمانوں پر آئے گا کہ نبوت کی راہ سے علم کی جو دولت ان کو ملی تھی دینے والا اس کو واپس لے لے گا، وہی پیشگوئی پوری ہو رہی ہے، گویا علم ہی مسلمانوں کو چھوڑ رہا ہے، لیکن وہ سمجھ رہے ہیں، کہ ہم اس کو چھوڑ رہے ہیں۔ آخر میں نگینہ والوں کو اسی خط میں یہ دھمکی بھی دی گئی ہے کہ

"بظاہر چناں می نماید کہ اگر ایں خوان نعمت را از نگینہ خواہند برداشت باز نخواہند گسترانید

انا للہ وانا الیہ راجعون" صہ۲ مکتوب یازدہم (مجموعہ قاسم العلوم)

شاید یہی دھمکی کارگر ثابت ہوئی، اسی کا نتیجہ ہے، کہ مدت دراز تک نگینہ کا یہ مدرسہ قائم رہا، اور نگینہ والے کسی نہ کسی طرح اس کو چلاتے ہی رہے۔

بہرحال قصبہ دیوبند کے سوا قرب و جوار کی چھوٹی بڑی آبادیوں میں مدرسے جو قائم ہو رہے تھے، آج تو عموماً یہ مدرسے جداگانہ ہستی، اور مستقل وحدت کی حیثیت میں نظر آتے ہیں۔ لیکن قدیم رودادوں کے جائزے سے اس کا انکشاف ہوتا ہے، کہ کافی مدرسے ان میں ایسے بھی تھے، جو باضابطہ دارالعلوم دیوبند کی مرکزیت کو تسلیم کر کے اس کے ساتھ اسی طرح ملحق تھے، جیسے جدید عصری جامعات اور یونیورسٹیوں کے ساتھ مختلف شہروں میں قائم ہونے والے کلیات اور کالج ملحق ہوا کرتے ہیں۔ ان الحاقی تعلیم گاہوں کی تعلیم و نصاب مدرسین کا تقرر، ان کے امتحانات، ان کی آمد و خرچ کا حساب و کتاب، یہ اور اس قسم کے سارے متعلقہ امور پر براہ راست دارالعلوم کی نگرانی قائم تھی، دستور یہ بھی تھا کہ دارالعلوم کی سالانہ روداد کے ساتھ ان الحاقی مدارس کے نتائج امتحانات، اور آمد و خرچ کے حسابات بھی بطور ضمیمہ التزاماً شریک ہو کر شائع کئے جاتے تھے، ۱۲۹۳ھ یعنی قیام دارالعلوم کے گیارہ سال بعد پرانی رودادوں میں ایک جدید عنوان یہ ملتا ہے، یعنی

"ذکر مدارس شاخہائے مدرسہ اسلامی دیوبند"

پہلی دفعہ ۹۳ھ کی روداد میں اس عنوان کے نیچے یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ

اس مدرسہ کی چند شاخیں بھی بعض اہل اسلام کی ہمت سے جاری ہیں" صہ۴۲

لیکن اسی سال کی روداد میں ہمیں ایک تجویز ملتی ہے، درسی کتابوں کی نایابی وکمیابی کی دشواریوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے یہ لکھ کر کہ

"یہ مشکل بہ توجہ تاجران کتب، واہل مطابع حل ہو سکتی ہے"

گویا ملک کے اسی خاص طبقہ کو متوجہ کر کے تجویز بایں الفاظ پیش کی گئی ہے۔

"یعنی ان کتب کو بکثرت چھاپیں، اور فروخت کریں، اور کسی قدر وقف خرچ مدرسہ بھی فرما کر شامل نفع دین ودنیا ہوں"

جیسا کہ میں نے عرض کیا، یہ تجویز کس کی پیش کی ہوئی ہے، روداد میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا، لیکن دارالعلوم کا سارا کاروبار جس کی نگرانی اور مشورے کی روشنی میں انجام پا رہا تھا۔ بظاہر خیال یہی گذرتا ہے کہ ان ہی کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی ہوگی اور ان ہی کے اشارے سے مہتمم صاحب مدرسہ نے روداد میں اس کو غالباً درج کیا ہے۔ یوں بھی سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کا مطابع سے خاص تعلق تھا آپ کی عمر کا اکثر وبیشتر زمانہ گذر چکا کہ مطابع میں تصحیح کتب کی خدمت میں گذرا تھا بلکہ اسی فقرے کو پڑھ کر میرا ذہن خدا جانے لکن کن مسائل کی طرف منتقل ہونے لگا۔ علمی خدمات کے سلسلے میں تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ کا عربی کتابوں کے چھاپہ خانوں کی خدمت کو قبول کرنا، غدر سے پہلے زیادہ تر آپ کا اسی مشغلہ میں مصروف رہنا، فتنہ کے فرو ہونے کے بعد عربی خط نسخ کے سب سے بڑے مرکزی جگت استاذ نزہت رقم یعنی منشی ممتاز علی صاحب مرحوم کے ساتھ آپ کے خصوصی تعلقات جن کا ذکر کر چکا ہوں، ان ہی منشی ممتاز علی مرحوم کا

لے مجھ سے بلا واسطہ مولٰنا نظام الدین مغربی حیدرآبادی مرید خاص حضرت مولٰنا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ نے بیان کیا جب میں حیدرآباد میں مقیم تھا، کہ ان سے حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم نے فرمایا، (نیز میرے والد صاحب نے بھی مجھ سے یہی واقعہ دوسرے عنوان سے بیان فرمایا) کہ حضرت نانوتوی کی حیات میں دارالعلوم کا اہتمام میں نہیں کرتا تھا بلکہ درحقیقت حضرت نانوتوی فرماتے تھے۔ کیونکہ انتظام کی جو چیز حضرت نانوتوی کے قلب پر وارد ہوتی تھی، اس کا بعینہٖ انعکاس میرے قلب پر ہو جاتا تھا، اور میں اس کام کو کر گذرتا تھا۔ میرے کام کر لینے پر حضرت نانوتوی فرماتے کہ مولانا اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے، میرا دل بھی چاہتا تھا کہ ایسا ہو جائے۔ پھر یہی واقعہ میں نے حاجی امیر شاہ خاں صاحب سے بھی سنا، آگے متن میں بھی اس روایت کا حوالہ آرہا ہے۔

محمد طیب غفرلہٗ

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

شاید یہ صورت جتنی خوفناک شکلوں میں آج سرزمین ہند میں پیش آئی ہے، انسانی تاریخ میں اس کی مثالیں مشکل ہی سے مل سکتی ہیں، معاملہ کہاں سے کہاں پہنچا دیا گیا۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا آخری زمانہ تقریری و تحریری مناظروں اور مباحثوں میں جو گذرا، جس کی بحث آگے آئے گی، شاید اس عجیب و غریب انقلاب کے بعض پوشیدہ اسباب سے اس بحث میں پردہ اٹھایا جائے۔ اس وقت تو "دارالعلوم دیوبند" کے ساتھ آپ کے تعلقات اور آپ کی خدمات کا ذکر کر رہا تھا۔ اس سلسلہ میں اپنے نزدیک جو پہلو مستحق تھا کہ اسے اجاگر کیا جائے۔ اپنی معلومات کی حد تک اس کام کو گویا پورا کر چکا ہوں۔

یاد ہوگا کہ پندرھواں سال بھی ابھی مدرسہ کا پورا نہیں ہوا تھا، کہ سیدنا الامام الکبیر کی سرپرستی کی برکات سے وہ محروم ہو گیا، ان پندرہ سالوں میں بھی ابتداء کے چند سال عرض کر چکا ہوں، ایسے بھی گذرے ہیں، جن کے متعلق یہ تسلیم کرنا چاہئے، کہ قصبہ دیوبند کا بہ مقامی مدرسہ صحیح معنوں میں براہ راست سیدنا الامام الکبیر کے فیوض و برکات سے مستفید نہ ہو سکا، نام تو حضرت والا کا شروع ہی سے خصوصی ارکان کی فہرست میں شریک تھا۔ لیکن ہندگیر جامعہ بننے کے لئے آپ کی آغوش شفقت میں بعد کو آیا، پھر حج کا سفر بھی جس کا ذکر آگے آ رہا ہے، اسی زمانہ میں ہوا، جسمانی امراض و آلام کے ہجوم اور حملہ کا زمانہ بھی یہی ہے۔ ان ہی وجوہ سے پندرہ سال کی اس مدت کو پندرہ سال سے بھی کم ہی سمجھنا چاہئے، گویا دس سے بارہ سال تک کی مدت سے زیادہ اس کا تخمینہ مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے

حیرت اسی پر ہوتی ہے کہ اسی محدود مدت میں ضلع سہارنپور کے ایک غیر معروف قصبہ کا مقامی مدرسہ جس کے پہلے سال کی آمدنی ہر مد کی کل چھ سو انچاس (۶۴۹) روپے چار آنے (۴ھر) تھی امداد طلبہ کی مد کو نکال دینے کے بعد اصل مدرسہ کی آمدنی درحقیقت کل چار سو ایک روپیہ ہوئی تھی، کل دو مدرس یعنی ایک عربی اور ایک فارسی و ریاضی وغیرہ کے لئے مقرر ہوئے تھے۔ کل بیس طالب علم شروع میں شریک ہوئے تھے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سال بھر کے سارے مصارف کے بعد بھی (۲۵۵) دو سو پچپن

روداد میں چھاپ کر شائع کردیا گیا تھا۔ خط میں ان ہی باتوں کا تذکرہ کرکے کہ کل چار قلمی نسخے اس کتاب کے تیار کئے گئے تھے، جن میں ایک نسخہ آپ کے مدرسہ کے لئے اس لئے بھیجا جارہا ہے، کہ

"مدرسۂ آنحضرت کہ منبع فیض عموم ست، فرستادہ آمد تا یادگار آں بزرگوار بر محلِ خود باشد"

اگرچہ رسمی طور پر خط میں مدرسہ کے مہتمم مولوی رفیع الدین اور صدر حضرت مولانا محمد یعقوب، اور مجلس شوریٰ کے ایک رکن حاجی محمد عابد کے نام بھی مکتوب کے عنوان میں درج ہیں، لیکن اس سلسلے میں سب سے پہلے جسے علامہ احمد حمدی آفندی نے اپنا مخاطب اول بنانا چاہا ہے، وہ حضرت سیدنا الامام الکبیر ہی کی ذات مبارک تھی، مکتوب کا آغاز ان الفاظ سے ہوا ہے۔

"جناب فضائل مآب، مولوی محمد قاسم صاحب"

یہ "جناب فضائل مآب" کے الفاظ صرف حضرت والا کے اسم گرامی سے پہلے استعمال کئے گئے ہیں۔ باقی دوسرے بزرگوں کے نام کے ساتھ صرف "مولوی" کا لفظ ہے۔

کچھ بھی ہو، قاف تا قاف کی پرانی ضرب المثل کے متعلق تو نہیں کہہ سکتا، لیکن عصری تقریروں میں ساحل باسفورس تا دیوار چین کا جو محاورہ مستعمل ہے، یہ واقعہ ہے، کہ قریب قریب دس انگلیوں پر گنے جانے والے سالوں کے اندر اندر دیوبند کے قصبہ کا یہی مدرسہ، شاعرانہ رنگ میں نہیں، بلکہ فی الحقیقت اپنی شہرت و عظمت میں حیرت ہوتی ہے، کہ واقعی ان ہی حدود تک کیسے پہنچ گیا تھا۔ ہندوستان کے لحاظ سے چین کی دیوار برہما اور تبت ہی کے علاقے تو ہیں، اور باسفورس کے ساحل کے خوبصورت شہر استنبول (قسطنطنیہ) سے آپ دیکھ رہے ہیں کہ علمی تحائف وہاں سے چلے آرہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ میں تو اس کی توجیہ سے اپنے آپ کو عاجز پاتا ہوں، کہ مصر کے سوا زمین کے اس کرے پر حالانکہ بیسیوں اسلامی ممالک چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن قسطنطنیہ کے اس عالم کی اپنی کتاب کے لئے مصر کے بعد نظر انتخاب ہندوستان جیسے دور دراز ملک اور اس ملک میں بھی ضلع سہارنپور کی ایک قصباتی آبادی کے مدرسہ پر کیوں پڑتی ہے۔ ہندوستان میں اس وقت مسلمانوں کا سیاسی اقتدار بھی ختم ہو چکا تھا، اور مسلم و غیر مسلم باشندوں کا ایک ایسا ملک وہ بن چکا تھا، جس پر تیسری طاقت

حکمران تھی، اس کے سوا اور کیا سمجھا جائے کہ جو اللہ کے لئے مٹنے کا قطعی فیصلہ کر چکا تھا اٹھانوے الااسی کو سر اٹھا رہا تھا، اونچا کر رہا تھا، اور یہ سب جو کچھ تھا، اسی کی رفعت و بلندی کے مختلف مشاہداتی مظاہر تھے، من تواضع للّٰہ رفعہ اللّٰہ کی گویا یہ بھی ایک عملی تفسیر تھی، اس کے سوا بتایا جائے کہ آخر کیا سمجھا جائے؟ تاویل و توجیہ میں اور کیا کہا جائے؟

بہرحال گنے چنے، ان ہی چند سالوں میں کرایہ کے خام مکانوں سے نکل کر اپنی موجودہ تدریسی و اقامتی عمارت میں بھی منتقل ہوا، جس کی تفصیل دارالعلوم دیوبند کی تاریخ لکھنے والے کے فرائض میں داخل ہے، یعنی یہ سوالات کہ شروع میں دیوبند کا یہ مدرسہ کہاں قائم ہوا۔؟ جن مکانوں میں مدرسہ کا افتتاح عمل میں آیا، ان کی تعمیری نوعیت کیا تھی، کن کن لوگوں کے مکانات کرایہ پر لئے گئے، کرایہ کی مجموعی رقم کیا تھی، پھر کن دشواریوں کا احساس ارباب اہتمام و انتظام کو ہوا، اور طے پایا کہ مدرسہ کی مستقل عمارت بنائی جائے، اس سلسلہ میں پہلے دیوبند کی جدید جامع مسجد جو اسی زمانہ میں بعض ارباب ہمم کی جدوجہد کی بدولت بن کر تیار ہوئی تھی، فیصلہ کیا گیا کہ اسی جامع مسجد کے آس پاس چند حجرے اگر بنا لئے جائیں گے وہی کافی ہوں گے، حاجی عابد حسین صاحب مرحوم مدرسہ کے مہتمم اول نے اسی تجویز کے مطابق مسجد کے گرد کچھ حجرے تیار بھی کرا دیئے تھے، لیکن حال سے زیادہ جس کے سامنے مدرسہ کا مستقبل تھا، ہم آج جو کچھ دیکھ رہے ہیں، سب کچھ شاید اس کو پہلے ہی دکھایا جا چکا تھا، اپنی اسی لاہوتی بصیرت کی روشنی میں مدرسہ کے لئے پہلے زمین کا انتخاب کیا، زمین کیسے حاصل کی گئی، اور تقدیر کا وعدہ تدبیر کا قالب اختیار کر کے مسلسل کیسے سامنے آتا چلا گیا، ظاہر ہے "یہ دارالعلوم کی تاریخ" کے اہم اجزا ہیں، جب کبھی لکھنے والوں کو اس کی طرف توجہ ہوگی، وہی تحقیق کر کر کے ہر منزل کی روداد کو پیش کر سکتے ہیں۔ اس کتاب کی حد تک زیادہ سے زیادہ گنجائش اسی کی ہے، کہ ان چند سالوں یعنی ۱۲۸۳ھ آغاز تاسیس سے ۱۲۹۷ھ تک جس سال سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی اس درمیانی وقفہ میں جو کچھ ہوا، اس کا اجمالی ذکر کر دیا جائے۔

عرض کر چکا ہوں، کہ تاسیس مدرسہ کے دوسرے سال ۱۲۸۴ھ میں حاجی عابد حسین صاحب مرحوم مدرسہ کی

مہتمی سے دستکش ہو کر سفر حج پر روانہ ہو گئے، ان کی جگہ مولانا رفیع الدین صاحب کو سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ نے مجبور کیا کہ وہ اہتمام کی ذمہ داری اپنے سر لیں۔ حاجی عابد حسین صاحب کی واپسی حجاز سے ۱۲۸۶ھ میں ہوئی۔ اہتمام کی خدمت پھر ان ہی کے سپرد ہو گئی، ۱۲۸۸ھ تک وہی مہتمم رہے، پھر ۱۲۸۸ھ میں مجلس شوریٰ نے حاجی عابد حسین صاحب مرحوم کو اس خدمت سے سبکدوش کر دیا، مگر جامع مسجد کی تعمیر ان کے سپرد رہی، اور مدرسہ کے اہتمام و انتظام کا کام پھر مولانا رفیع الدین صاحب کے سر ڈالا گیا۔ اور اسی سال جو قیام مدرسہ کا چھٹا سال تھا، ایک طویل الذیل اپیل روداد میں شائع کی گئی، جس میں مدرسہ کے لئے مستقل عمارت کی تحریک پیش کی گئی تھی۔ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کا یہ ایک خاص ورق، اور اہم تاریخی وثیقہ ہے، اس میں پہلے تو مدرسہ کی مکانی دشواریوں کا ذکر کیا گیا ہے، کرایہ کے جن مکانوں میں اس وقت تک مدرسہ تھا، کچھ ان کی حالت، درسگاہ، طلبہ کی قیام گاہ، کتب خانہ کا مکان ان سب میں کافی فاصلہ، نیز درسگاہ کے تنگ غیر تدریسی مکان میں پڑھانے والے اور پڑھنے والوں کو جو دقتیں پیش آ رہی تھیں، مثلاً اجتماعی تدریس کی وجہ سے شور کا بلند ہونا اور شور کو محسوس کر کے

"ہر شخص کو اس ضرورت سے کچھ آواز بلند کرنی ہوتی ہے، اور جتنی جتنی آواز بلند ہوتی جاتی ہے، اتنا ہی شور بڑھتا ہے۔"

پھر قصبہ ہونے کی وجہ سے وسیع مکانوں کی دستیابی میں ناکامی، سب سے دلچسپ اطلاع یہ ہے کہ قصبہ والوں کے خام کچے، ٹوٹے پھوٹے مکانوں کو کرایہ پر مدرسہ نے جو لے لیا تھا، تو جہاں اسی دیوبند میں ایک طبقہ ان مسلمانوں کا تھا، جو سب کچھ مدرسہ پر نچھاور کر رہا تھا، وہیں روداد کے اس فقرے کو پڑھ کر

"مکان مدرسہ کا اول تو کرایہ کا ہے، اور ہر سال نیا معاملہ کرنا ہوتا ہے اور مالک مکان کے بسبب اس کے کہ حاجت مند جانتے ہیں ہر سال کچھ نہ کچھ کرایہ زیادہ کرنا چاہتے ہیں۔"

صہ ۳ روداد ۱۲۸۸ھ ہجری

ان الفاظ کو پڑھ کر کم از کم میری گردن تو جھک گئی، مسلمانوں پر جو افتاد پڑی تھی، اور پڑتی چلی جارہی ہے،
اس کی تہ میں ٹٹولنے سے کچھ اسی قسم کے اسباب کا نشان ملتا ہے، ماظلمناھم ولکن کانوا انفسھم
یظلمون کے قرآنی قانون کی یہی زندہ شہادتیں ہیں۔

بہرحال یہ اور اسی قسم کے متعدد اسباب و وجوہ کا تذکرہ کرنے کے بعد آخر میں مجلس شوریٰ کی اس تجویز
سے مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا ہے کہ

"ایک مکان وسیع، بافراغت، جس میں قریب ایک سو طلبہ بآرام تمام رہ سکیں، اور چار
پانچ درسگاہ بھی ہوں اور رفع حوائج ضروریہ کی جگہ بھی اس میں ہو، تیار ہو" صـ۳

آج دارالعلوم دیوبند کی فلک پیما، کوہ ہیکل، عمارتوں کا سلسلہ طویل و عریض رقبہ میں پھیلا ہوا ہے یہی
پہلی تجویز اس تناور درخت کا تخم اول تھی، تجویز شائع کردی گئی، تعمیر کی مد میں رقوم آنے لگیں۔ سنہ ۱۲۸۹ھ
کی روداد سے معلوم ہوتا ہے، کہ حاجی عابد حسین صاحب حالانکہ مدرسہ کی مہتمی سے سبکدوش کئے جاچکے
تھے، اور جامع مسجد کی تعمیر میں مصروف تھے، انہوں نے اپنی اسی جامع مسجد کے اردگرد چند چھوٹے
بڑے حجرے بنوانے شروع کردیئے۔ حاجی صاحب مرحوم کا خیال تھا کہ یہی حجرے دیوبند کے
مدرسہ کے لئے کافی وافی ہوں گے۔ اگرچہ ارباب شوریٰ نے حاجی صاحب کی اس رائے کی بظاہر
مخالفت نہیں کی۔ بلکہ اسی سنہ ۱۲۸۹ھ کی روداد میں تعمیری مد کے زرِ اعانت کے متعلق یہ بھی لکھدیا گیا تھا کہ تعمیر کا
کام ان ہی کے ہاتھ میں ہے اس لئے چاہئے، کہ اس مد کی رقوم

"بخدمت حاجی صاحب ممدوح الصدر مہتمم جامع مسجد ہی کے ارسال فرمائیں" صـ۴

لیکن سچ پوچھئے، تو مدرسہ کا مستقبل جس کے سامنے تھا، وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا، نہ دیکھنے والوں
کے لئے اس کا دکھانا بھی دشوار تھا، اور جب تک وہی سب کچھ دوسروں کو بھی نہ سوجھتا، جو وہ دیکھ
رہا تھا لوگ یہ کیسے باور کر سکتے تھے، کہ ضلع سہارنپور کی ایک قصباتی آبادی کا نام تعلیم و تعلم، درس و تدریس
کی تاریخ میں ایک ایسی ٹھوس حقیقت کا قالب اختیار کرنے والا ہے، کہ عام تعلیمی تاریخ نہ سہی لیکن
اسلامی علوم کی تعلیم و تدریس کی ہندوستان ہی کی حد تک نہیں، بلکہ بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ سارے

عالم اسلام کی تعلیمی تاریخ کا یہ شعبہ اس کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ حال اور مستقبل کے متعلق نقطۂ نظر
کے اسی اختلاف کا اثر دلوں میں کشمکش کی ایک ایسی نفسیاتی کیفیت کو پیدا کئے ہوئے تھا، جس پر زیادہ
دن تک صبر شاید برداشت سے باہر ہو چکا تھا، حاجی صاحب مرحوم جامع مسجد کے اردگرد جو
حجرے بنوا چکے تھے، دوسری مسجدوں کے حجروں کی طرح طلبہ کی اقامت گاہوں کا کام ان سے
لیا جا سکتا تھا، اور یہی کام ان سے بعد کو لیا بھی گیا، آج تک لیا جا رہا ہے۔ اس لئے ان کی تعمیر میں
مزاحمت تو مناسب نہ خیال کی گئی، جو کچھ وہ کر رہے تھے، چھوڑ دیا گیا کہ کرتے رہیں۔ اور خود
مجلس شوریٰ نے جیسا کہ ۱۲۹۱ھ کی روداد میں مدرسہ کے مستقل اور وسیع مکان کی تعمیر والی تجویز کا ذکر کر کے
یہ اطلاع دی گئی ہے کہ

"۱۹ ذیقعدہ ۱۲۹۱ھ ہجری صلعم بروز جمعہ عین جلسہ انعام طلبہ میں اس کے لئے گزارش
کیا" ص۳۵

کاغذی اپیل کے بعد باضابطہ "جلسہ تقسیم انعام" میں تعمیر والی یہ تجویز عام مسلمانوں کے مجمع میں پہلی دفعہ
پیش کی گئی۔ لکھا ہے کہ

"برابر فرد چندہ پر دستخط ہوتے چلے جاتے ہیں، جس میں بہت سا روپیہ وصول ہو تا جاتا ہے"
چند ہی دنوں میں اتنی رقم فراہم ہو گئی کہ اسی سال

"ایک قطعہ نہایت وسیع واسطے تعمیر مکانات کے خرید لیا گیا" ص۵۳ روداد ۱۲۹۱ھ

ان واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے، تمہید میں جو یہ الفاظ درج کئے گئے ہیں، کہ یہ
"آرزو دیرینہ جس کی سالہا سال سے امید تھی"

اور اسی سے سمجھ میں آتا ہے، کہ جامع مسجد کے اردگرد جو حجرے تعمیر ہو رہے تھے، ۱۲۸۹ھ کی روداد میں جس
کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا تھا کہ اس کی طرف

"جناب عمدہ اہل صفا، خیر خواہ خلائق جناب حاجی محمد عابد صاحب مہتمم سابق مدرسہ ھذا،
حال مہتمم تعمیر جامع مسجد نے توجہ تام فرمائی، اور احاطۂ مسجد ہی میں جملہ حوائج ضروریہ درسگاہ

قیام گاہ طلبہ و دیگر ضروریات) کے لئے موقع مناسب کے مکان تجویز فرمائے" ص۸
یہ شاید حاجی صاحب مرحوم کی ذاتی تجویز تھی، جس کی مزاحمت نہیں کی گئی تھی، لیکن تعمیر کی دیرینہ آرزو، جس کی سالہا سال سے امید تھی" اس کے مقابلہ میں گویا اس کی حیثیت گونہ اصرار بے جا ہی کی سی تھی، شاید اسی لئے جامع مسجد کے حجروں والی تجویز بجائے ارباب شوریٰ کے براہ راست حاجی صاحب مرحوم کی طرف روداد میں منسوب کی گئی ہے، مدرسہ کی تاریخ میں آئندہ بعض ناگفتہ بہ ہنگامی اختلافات جو پیش آئے، بظاہران کی ابتدار شاید اسی واقعہ سے ہوئی، کچھ نہ کچھ جس کی کسک آج تک قلوب میں باقی ہے، مگر میری بحث کے موضوع سے یہ مسئلہ ہی خارج ہے، میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں، کہ دور قاسمی میں مدرسہ کن منزلوں کو طے کر چکا تھا۔ مدرسہ کی مستقل تعمیر کے لئے ۱۲۹۱ھ میں زمین خرید لی گئی، اور ۲ ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ میں جیسا کہ ۱۲۹۲ھ کی روداد میں اطلاع دی گئی ہے، تقسیم اسناد و انعامات کا بھی جلسہ منعقد ہوا، جس میں غیر معمولی طور پر علاوہ دیوبند کے کافی تعداد باہر سے آنے والے معزز مہمانوں کی بھی تھی، ان میں وقت کے بعض سر برآوردہ علماء، اور امرار بھی تھے۔ آخر میں لکھا ہے، کہ

"کل اہالیان جلسہ اس موقعہ پر تشریف لائے، جہاں تعمیر مکان مدرسہ کی بنیاد کھدی ہوئی تھی، اول پتھر بنیاد کا جناب مولنا مولوی احمد علی صاحب سہارنپوری نے اپنے دست مبارک سے رکھا، اور بعد میں جناب مولٰنا مولوی محمد قاسم صاحب و مولانا مولوی رشید احمد صاحب و مولٰنا مولوی محمد مظہر صاحب نے ایک ایک اینٹ رکھی" ص۱۰ روداد ۱۲۹۲ھ

لہ تعمیر مدرسہ کی تاریخ کی یہ معلومات تو وہ ہیں جو براہ راست مدرسہ کی قدیم رودادوں سے فراہم کی گئی ہیں، دارالعلوم کی تاریخ کے لکھنے والے مزید معلومات کا بھی اضافہ کر سکتے ہیں۔ فقیر نے بقدر ضرورت چیزوں کا انتخاب کر لیا ہے، اس موقعہ پر ارواح ثلاثہ کی اس روایت کا قدرتاً خیال آتا ہے جس کے بعض اجزار کا اسی کتاب میں مختلف موقعوں پر ذکر گذر بھی چکا ہے، ارواح ثلاثہ کی اس روایت میں سنگ بنیاد کے متعلق یہ اضافہ پایا جاتا ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر کے اشارہ سے حضرت مولٰنا اصغر حسین صاحب کے نانا جو میاں جی منے شاہ صاحب کے نام سے مشہور تھے، وہی طلب کئے گئے اور پہلی اینٹ انہی کے دست مبارک سے رکھوائی گئی۔ لکھا ہے کہ میاں جی منے شاہ صاحب علاوہ سید ہونے کے خود بڑے بزرگ تھے۔ بلکہ میرا حافظہ غلطی نہیں کر رہا ہے تو یاد آتا ہے کہ میر شاہ خان مرحوم حضرت نانوتویؒ کے حوالہ سے یہ بیان کرتے تھے کہ میاں جی منے شاہ ایسے آدمی ہیں جن کے دل پر گناہ کا شاید خطرہ بھی نہیں گذرا" واللہ اعلم دوسری بات (باقی اگلے صفحہ پر)

اس کے بعد مدرسہ کی تعمیر کا سلسلہ جاری رہا، دور دراز مقامات سے بھیجنے والے تعمیری مد میں رقوم مسلسل ارسال کر رہے تھے، خصوصاً حیدر آباد دکن کے ارباب خیر نے تو گویا ایک مجلس ہی بنالی تھی، جو مدرسہ کی تعمیر کے لئے زر اعانت وصول کرتے تھے، اور بھیجتے جاتے تھے، اس باب میں اسلامیان دکن کی دلچسپیاں اس حد تک پہنچ گئی تھیں، کہ سنہ ۱۲۹۶ھ کی عام روداد کے علاوہ خاص حیدر آباد کے مسلمانوں کے امدادی چندوں کی تفصیل کے لئے ایک علٰحدہ کتابچہ ۲۶ صفحوں کا مدرسہ کو شائع کرنا پڑا، جس کا ایک مطبوعہ نسخہ اس وقت میرے سامنے بھی ہے، تمہیدی عبارت اس "دکنی کتابچہ" کی یہ ہے، حمد و نعت کے بعد عام مسلمانوں کو مخاطب کر کے لکھا گیا تھا،

"ان دنوں چند بزرگواران والا ہمت مفصلۂ ذیل ساکنان بلدۂ فرخندہ (بنیاد) حیدر آباد دکن نے اپنے وجود باجود کو ابتغاءً لوجہ اللہ و مرضاتہ تائید مدرسہ عربیہ دیوبند کے لئے گویا وقف کر دیا ہے، اور اس کی اعانت کے واسطے کمر بہت چست باندھی ہے" ص ۱

آگے ہندوستان کے دوسرے شہروں کے مسلمانوں کو حیدر آباد کے غیور، اولو العزم والا ارادہ بھائیوں کے نقش قدم پہ چلنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، کہ فراہمی چندہ کے لئے جیسے حیدر آباد میں ایک مستقل

(گذشتہ صفحہ سے) یہ ہے کہ میاں جی صاحب مرحوم کے بعد حضرت نانوتوی ہی کی التجا پر حاجی عابد صاحب نے دوسری اینٹ رکھی۔ پھر حضرت گنگوہی نے لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ روداد کی روایت اور اس روایت میں کتنا فرق ہے، ترجیح کے لحاظ سے ظاہر ہے کہ تحریری وثیقہ کی روایت کا مقابلہ زبانی سینہ بسینہ والی روایت نہیں کر سکتی، اور تطبیق کی راہ اگر اختیار کی جائے تو اولیت کو بجائے حقیقی کے اضافی قرار دے کر کہہ دیا جا سکتا ہے کہ میاں جی صاحب تو صاحب ل ہونے کی حیثیت سے اول تھے، علماء میں حضرت مولانا احمد علی صاحب اول اور شوریٰ کی مجلس کے ارکان میں اول حاجی عابد صاحب تھے۔ سوانح قاسمی میں حاجی عابد صاحب مرحوم کے اختلافی نقطۂ نظر کو بھی واضح لفظوں میں بیان کیا گیا ہے، لکھا ہے کہ جلسہ تقسیم انعام میں سیدنا الامام الکبیر نے جب سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب میں شریک ہونے کیلئے حاضرین جلسہ کو دعوت دی، تو حاجی صاحب تلملا اٹھے، اور غصہ میں چھتہ کی مسجد میں جا کر بیٹھ گئے۔ سیدنا الامام الکبیر مجمع کو ساتھ مدرسہ کی زمین کی طرف چل پڑے، مجمع آگے بڑھ گیا اور خود چھتہ کی مسجد میں پہنچ کر حاجی صاحب سے منت سماجت کی، جس پر وہ رو پڑے دونوں بغل گیر ہوئے صفائی ہو گئی۔ ان کو ساتھ لیکر سیدنا الامام الکبیر بھی مجمع میں تشریف لائے، دلچسپ لطیفہ سوانح قاسمی کی روایت کا یہ ہے کہ باایں ہمہ کشاکشی مدرسہ کی یہ زمین حاجی عابد صاحب مرحوم ہی کے نام خریدی گئی تھی، لکھا ہے کہ "بیع نامہ" ان ہی کے نام لکھوایا گیا تھا۔ اسی میں یہ بھی ہے ۱۳ گز پہلی دفعہ زمین کا یہ قطعہ خریدا گیا تھا۔

پورا کیا، قریب قریب ایک صدی گویا ختم ہو رہی ہے، اس عرصہ میں طولاً و عرضاً اس کے مختلف شعبوں میں جو ہر جہتی ترقیاں ہوئی ہیں۔ ان کا بھلا کون انکار کر سکتا ہے، لیکن بنیادی سالوں میں جن جن تخموں کو بونے والے بو کر چلے گئے، سچ تو یہ ہے کہ ابھی صحیح معنوں میں ان ہی کی نشو و نما میں کامیابی نہیں ہوئی ہے، اسی لئے دارالعلوم کی حد تک اپنا خیال تو یہی ہے، کہ نئی تجویزوں سے زیادہ ضرورت اس کی ہے، کہ عہد قاسمی کے کلیات کی روشنی میں عملی اقدامات کی طرف توجہ کی جائے، جو کچھ اس وقت تک سوچا جا چکا تھا، اسی کو عمل کا قالب عطا کیا جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ ماضی کی تاریخ کا صحیح اور مفید مطالعہ یہی ہو سکتا ہے، جس سے مستقبل کے سلجھانے میں مدد لی جائے ورنہ گذرے ہوئے واقعات کا اعادہ، واقعات ہی کا اعادہ کیوں نہ ہو، نتیجۃً ایک افسانہ سے زیادہ انصاف کی بات یہی ہے کہ وہ اور کچھ نہیں ہوتا۔

بحث کو ختم کرتے ہوئے آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عہد قاسمی کی جن رودادوں سے جو معلومات فراہم کی گئی ہیں، ان کو مرتب کر کے شائع کرنے والے یعنی حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حاجی عابد حسین صاحب مرحوم کے بعد جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، دارالعلوم کے مہتمم مقرر ہوئے تھے ان ہی کے بعض ذاتی اعترافات یہاں نقل کر دیے جائیں۔ زبانی روایت تو اس باب میں ان ہی کی طرف سے ارواح ثلثہ میں یہ پائی جاتی ہے، فرماتے تھے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسہ دیوبند کا اہتمام کبھی خود نہیں فرمایا، بلکہ اہتمام کیلئے مجھے طلب فرمایا، اور میں وہی کرتا ہوں، جو انہیں مکشوف ہوتا ہے۔"

صاف اور واضح لفظوں میں اپنے مافی الضمیر کی شرح خود مولانا رفیع الدین صاحب یہ کرتے تھے کہ

"علم ان کا (مولانا نانوتوی رح کا) عمل میرا ہے۔" ص۱۸۳

یہ روایت مولانا طیب صاحب کی ہے، جسے موصوف نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے اسی کتاب میں درج کیا ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ واضح و روشن، خود مولانا رفیع الدین قدس اللہ سرہ العزیز کی خود نوشتہ تحریری شہادت ہے، جو ۱۲۹۷ھ کی روداد میں بیذل اکبر درج

مذہب کو قبول کرلیں گے، ایک تو یوں بھی صحیح نہیں تھا کہ عیسائیت کی توحید خود تثلیث کے معمہ میں الجھ کر چیستاں بنی ہوئی تھی، اور گو اس ملک میں اسلام کے نمائندے اسلام سے زیادہ خود اس ملک کی مشرکانہ اوہام ہی میں لفظوں کے ایرپھیرے غوطے کھا رہے تھے۔ لیکن مسلمان نہ سہی، مسلمانوں کی آسمانی کتاب اور اس آسمانی کتاب کے لانے والے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ان کی کتابوں میں موجود تھی، اسی کے ساتھ ایک غیبی لطیفہ اس ملک میں ٹھیک اسی زمانہ میں حضرت مولنا سید شہید بریلوی اور ان کے رفقار صدیقین وشہدار رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی شکل میں اچانک ظاہر ہوا تھا۔ یہ حضرات خالص اسلامی توحید کے مجسم نمونہ بھی تھے، اور اسی کی منادی بھی ملک کے طول وعرض میں کمال جوش وخروش کے ساتھ کر رہے تھے۔

پس ہندوؤں کا وہ طبقہ، جو اپنے آبائی مشرکانہ دین کی صداقت سے جیسا کہ میکالے نے لکھا ہے ہٹ رہا تھا۔ ان میں عیسائیت، یا عیسائیت کے بغیر توحید کے قبول کرنے والوں کے ساتھ ساتھ واقعہ یہ پیش آیا تھا۔ ایک بڑا طبقہ تھا، جو اپنے ملک کے خالص توحیدی دین اسلام کو قبول کر رہا تھا، کس پیمانے پر قبول کر رہا تھا، اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے، کہ ۱۸۵۱ء میں تحفۃ الہند نامی مشہور کتاب ایک نومسلم مولوی محمد عبید اللہ صاحب کی جو شائع ہوئی تھی، اس میں مولوی صاحب نے اپنے قصبہ پائل (متصل لودھیانہ پنجاب) اور اسی کے گرد ونواح میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد جو بتائی ہے قریب قریب سو تو دہی پہنچ جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ انگریزی حکومت کی بدولت ملک ایک نئے ماحول سے آشنا ہوا تھا، اس ماحول کے دوسرے نتائج جو قصداً پیدا کئے جا رہے تھے۔ ان ہی کے ساتھ ساتھ قصد اور ارادہ کے بغیر اندر ہی اندر اسلام اور اسلامی توحید کی طرف بھی لوگ کھنچنے لگے۔ اسی کتاب میں بعض ایسے واقعات بھی مصنف کتاب نے نقل کئے ہیں، کہ اعلان اسلام سے پہلے اپنے خاندانی پروہت برہمن سے مذاقاً لکھا ہے کہ میں نے کہا کہ پروہت جی میں تو مسلمان ہوگیا۔ اس فقرے کو سن کر بجائے بگڑنے کے لکھا ہے کہ پروہت صاحب نے کہا کہ

مسلمانوں کے دورِ اقتدار کے ختم ہونے کے بعد سب سے پہلے پادریوں کو دیکھا جاتا ہے کہ بازاروں اور میلوں ٹھیلوں میں پہنچکر دوسروں کے عقائد و اعمال پر نکتہ چینی کر رہے ہیں۔ جس کے بعد مقابلہ کے لئے بھی لوگ کھڑے ہو جاتے تھے۔ لیکن عموماً یہ پادری جن میں زیادہ تر دیسی کالے رنگ والے پادری ہوتے تھے، جن کا علمی مواد بھی معمولی ہوتا تھا، اور کیا کہا جائے۔ لیکن جو واقعہ تھا، اس کا کیسے انکار کیا جائے کہ جن خاندانوں سے ان دیسی پادریوں کے حاصل کرنے میں عیسائی مشنری کے لوگ کامیاب ہوا کرتے تھے، ایک تو موروثی روایات ہی ان کی حد درجہ پست ہوتی تھیں ثانیاً محض رفع حاجت کے لئے دین قبول کرنے والوں سے کردار کی بلندی کی توقع عام طور پر کرنی بھی نہ چاہئے،

ہندوستان کے مروجہ مذاہب و ادیان پر اعتراضات کی ایک فہرست تیار کر لی گئی تھی، یہی فہرست ان کو رٹا دی جاتی تھی جس کا اعادہ کوچہ و بازار میں وہ کرتے پھرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ دل دکھانے والے اعتراضوں کے ان گراموفونوں کی طرف اسلام کے سنجیدہ علماء توجہ تو کیا کرتے، سچی بات یہ ہے کہ ان سے گفتگو یا بحث و مباحثہ کو علمی وقار کے مناسب بھی عموماً خیال نہیں کیا جاتا تھا۔

صرف غدر سے پہلے فنڈر نامی ایک مغربی نژاد پادری جو عربی اور فارسی یعنی مسلمانوں کی زبانوں کا ماہر تھا۔ جب وہ دند مچانے لگا، اور شورش زیادہ بڑھی، تو پس پردہ گو ایک اور صاحب تھے لیکن گفتگو کرنے کے لئے مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے مشہور بانی حضرت مولٰنا رحمت اللہ کیرانوی میدان میں اتر آئے تھے ۱۸۵۴ء میں ایک تاریخی مناظرہ بمقام آگرہ عیسائیوں اور مسلمانوں کا جو ہوا تھا اس میں ایک طرف یہی فنڈر، اور دوسری طرف مولٰنا رحمت اللہ صاحب مرحوم تھے، اس مذہبی مناظرے میں جیسا کہ مشہور ہے، فنڈر کو شکست فاش ہوئی تھی۔ مولٰنا رحمت اللہ نے عربی و فارسی دونوں زبانوں میں کافی کتابیں عیسائیوں کے موجودہ تثلیثی دین کی تنقید و تردید میں لکھیں، جن میں بعض مصر میں بھی شائع ہوئیں، بلکہ سنا ہے کہ ان کی کتاب دعوت الحق کسی زمانہ میں مصر کے دینی مدرسوں کے نصاب میں بھی شریک تھی۔

برگزیدہ ممتاز علماء میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے سوا تقریری مناظرہ و مباحثہ کے سلسلہ میں کسی اسلامی عالم کا نام مشکل ہی سے لیا جا سکتا ہے۔

البتہ مسلمانوں میں بعض غیرت مند افراد جو ہندوستان کے باضابطہ ممتاز علماء میں تو شاید شمار نہ ہوتے تھے، لیکن انہوں نے اسلامیات کے ساتھ ساتھ عیسائیوں کے دین کے متعلق بھی کافی معلومات فراہم کر لی تھیں۔ انہوں نے گویا اس زمانہ میں پادریوں سے بحث و مناظرہ ہی کو اپنا پیشہ بنا لیا تھا، جن میں دلی کے مولوی منصور علی صاحب نے خاص شہرت حاصل کی، بعد کو یہی "امام فن مناظرہ" کے خطاب سے مسلمانوں میں مشہور ہوئے، اس زمانہ میں بعض دلچسپ افراد بھی مسلمانوں میں پیدا ہو گئے تھے، جن میں ایک صاحب نعمان[1] بن لقمان نامی بھی تھے، جو اپنے آپ کو

"وکیل سرکار آباد قرار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"

زبان سے بھی کہا کرتے تھے، اور ان کی مہر پر بھی یہی الفاظ کندہ تھے

سچ تو یہ ہے کہ جہاں

"جھک رہی جاتا ہے پلہ جو گراں ہوتا ہے"

کا فیصلہ کنجڑن[2] اپنے ترازو کو دکھا کر کرتی ہو، اور اسی پر فتح کی تالی پٹ جاتی ہو، اس قسم کی مجلسوں میں

---

[1] میلہ خدا شناسی کی روداد میں بھی ان کا تذکرہ کیا گیا ہے، سید آل امام اکبر کے ساتھ شاہجہاں پور کے مناظرہ میں وہ بھی آئے تھے۔ لکھا ہے کہ تحصیل علم آدمی گلستاں سے زیادہ نہ تھی، لیکن پادریوں کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ ان ہی نعمان بن لقمان صاحب کی وہ مشہور نظم ہے، جس کے بعض اشعار اب بھی پرانے لوگوں کی زبانی سننے میں آتے ہیں، یعنی

نہ فیض محمد ہے آئے جس کا جی چاہے — نہ آئے آتش دوزخ میں جائے جس کا جی چاہے

معاذ اللہ فرزند خدا کہتے ہیں عیسیٰ کو — تو دادا کون ہے ان کا بتائے جس کا جی چاہے

[2] کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ آسمان پر اٹھا لے گئے اور تمہارے پیغمبر تو زمین ہی میں دفن ہوئے، اسی کا جواب کنجڑن کی ترازو کی ڈنڈی تھی۔ پادریوں کے مذاق کی پستی کا اندازہ اس تحریری شہادت سے بھی ہوتا ہے، جس کا ذکر اسی میلہ خدا شناسی کی روداد میں کیا گیا ہے، جب مسلمانوں کے وکیل نے کہا کہ مسیح تو بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے تھے تو اب انجیل کو ساری دنیا میں کیوں پھیلاتے پھرتے ہو، کسی دیس نہیں بلکہ ایک یورپین پادری نے کہا کہ بنی اسرائیل انسان تھے، پس بنی اسرائیل کی طرف جو مبعوث ہوا وہ انسانوں کی طرف مبعوث ہوا، پادری صاحب نے اپنی چھڑی کو دکھا کر کہا کہ چھڑی جہاں ہے لکڑی بھی ہے، یہ حد تھی مردہ ضمیری کی۔ ۱۲

سیدنا الامام الکبیر نے اس کے مقابلہ میں کچھ کہنا چاہا تو لکھا ہے کہ

"مولوی احمد علی صاحب ساکن نگینہ نے رد کا اور یہ کہا کہ کس کے مقابلہ میں کھڑے ہوتے ہو،

حق واضح ہوگیا، پھر کاہے کو اٹھتے ہو" ص ۳۹ میلہ خدا شناسی

اسی طرح عیسائیوں میں جو کالے پادری تھے، ان کے متعلق تو نہیں، لیکن نولس صاحب اور اسکاٹ صاحب

جو یوروپین نژاد پادری تھے، ان کے متعلق اس قسم کی باتیں مثلاً رخصت ہوتے ہوئے نولس صاحب نے

حضرت والا سے کہا تھا

"آپ کے اخلاق سے ہم بہت خوش ہوا، پھر نام و نشان مکان پوچھا"

یا بیان کیا ہے کہ

"تھوڑی دیر بعد موتی میاں صاحب نے آکر فرمایا، پادری کہتے تھے کہ گو یہ صاحب یعنی مولوی

محمد قاسم صاحب ہمارے خلاف کہتے تھے، پر انصاف کی بات یہ ہے کہ ایسی تقریریں اور ایسے

مضامین ہم نے نہ سنے تھے" (میلہ)

یہاں ہی موتی میاں کے حوالہ سے یہ روایت درج کی گئی ہے، کہ انہوں نے

"مولوی محمد قاسم صاحب سے فرمایا کہ پادری اسکاٹ صاحب آپ کی تعریف کرتے تھے، اور

کہتے تھے، کہ اس شخص کی باتیں بہت ٹھکانے کی ہیں، یہ مولوی نہیں یہ صوفی مولوی ہے"

ص۸ مباحثہ شاہ جہاں پور

اس سے بھی زیادہ دل چسپ بیان ایک یورپین پادری ینگ نامی کا ہے۔ بریلی کے رہنے والے مولوی

عبدالوہاب سے ایک دن اس نے اقرار کیا کہ خدا شناسی کے اس میلہ میں بھی شریک تھا۔ کہتا تھا کہ

بہت سے اس قسم کے جلسوں میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا، اور بہت سے علماء اسلام سے اتفاق گفتگو

ہوا، پر نہ یہ تقریریں سنیں، نہ ایسا عالم دیکھا۔ ایک پتلا دبلا آدمی میلے کپڑے، یہ بھی معلوم نہ ہوتا تھا کہ یہ

کچھ عالم ہیں، ہم جی میں کہتے تھے کہ "یہ کیا بیان کریں گے۔ لیکن تقریر سننے کے بعد اپنے تاثر کا اظہار

مولوی عبدالوہاب کے سامنے اسی نے ان الفاظ میں کیا تھا کہ

جس سے اس جھنجلاہٹ کا اندازہ ہوتا ہے، جو سیدنا الامام الکبیر کے قلب مبارک میں پادریوں کے اقوال واعمال سے طبعاً پیدا ہوگئی تھی اور جیسا کہ کہتے ہیں، چور کی داڑھی میں تنکے کی تلاش کرنا ہے، ہم ان عیسائی پادریوں ہی کو پاتے ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر کی تقریروں کا نشانہ وہ بھی اپنے آپ ہی کو قرار دیئے ہوئے تھے، ایک موقعہ پر اس کا تذکرہ فرماتے ہوئے، کہ خالق تعالیٰ جل مجدہ کی ذات پاک کو مخلوقات سے کیا نسبت؟ جب دو مخلوقوں، بلکہ دو آدمیوں کا حال یہ ہے کہ پادری صاحب کو کوئی اگر چمار کہہ دے، تو آپے سے باہر ہو جائیں، حالانکہ پادری صاحب اور چمار میں کیا فرق ہے۔ یہ بھی مخلوق، وہ بھی مخلوق، وہ بھی انسان یہ بھی انسان، ان کے پاس بھی دو آنکھیں ایک ناک اور دو کان، تو اس کے پاس بھی یہی سب کچھ، حالانکہ یہ ایک بالکل برجستہ تمثیلی بات تھی، لیکن لکھا ہے کہ یہی کالے پادری صاحب محی الدین شادی کھڑے ہو کر سیدنا الامام الکبیر کو براہ راست مخاطب بناتے ہوئے چلانے لگے کہ

"آپ نے کل بھی بعض کلمات سخت کہے تھے اور آج بھی اب آپ نے بعض کلمات سخت بیان کئے۔" ملہ مباحثہ

یعنی کل انجیل کے الحاقی فقرے کو نجاست سے تشبیہ دی، اور آج پادری کو چمار سے تشبیہ دی گئی، لکھا ہے کہ چیں بر جبیں ہو کر اس نے سیدنا الامام الکبیر کو خطاب کر کے یہ بھی کہا کہ

"ہم تمہارے سن وسال کا لحاظ کرتے ہیں۔"

بہر حال عیسائی جیسی کہتے تھے، ان روداروں سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے ویسی نہیں، تو کچھ نہ کچھ اس جیسی بات کبھی کبھی ان کو سنا بھی دی جاتی تھی، لیکن اسی میدان مباحثہ میں مسلمانوں کے مقابلہ میں حالانکہ ہندو بھی صف آرا تھے، اور آپ دیکھ چکے کہ کرنے کی حد تک کافی اشتعال انگیز اقدامات ان کی طرف سے بھی مسلسل ہوتے رہے، لیکن ان کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر کا رویہ اول سے آخر تک دونوں ہی میلوں میں، میلوں کے ہر اجلاس میں، اجلاسوں کے اندر بھی، اور ان سے باہر بھی کچھ ایسا رہا، کہ شاید صلح وعفو، درگذر کے سوا ہم آپ کے اس رویہ اور روش کو گویا اور کچھ نہیں کہہ سکتے، کہنے والا چاہے، تو کہہ سکتا ہے، کہ ان دونوں متقابل فرقوں میں سے ایک کے ساتھ یعنی عیسائیوں کے ساتھ

کے بعد یہاں پہنچے، وہ باہم ہندوؤں سے سنا گیا کہ کہہ رہے تھے، کہ

"مسلمانوں کی طرف سے ایک پتلا سا آدمی، میلے کپڑے، نیلی لنگی بغل میں دبی ہوئی، بیان کرنے کھڑا ہوا، ایسی تقریر بیان کی کہ پادریوں کو کچھ جواب نہ آیا۔"

صرف یہی نہیں، بلکہ یہی صاحب جنہوں نے کھتریوں کی یہ گفتگو سنی تھی، وہی کہتے تھے، کہ آخر میں ان ہی کھتریوں میں سنا کہ کوئی اپنے قلبی تاثر کا اظہار ان الفاظ میں کر رہا ہے، یعنی سیدنا الامام الکبیر کی طرف اشارہ کر کے اس نے کہا کہ

"کوئی اوتار ہوں، تو ہوں۔" ۴۴

تقریباً یہ اسی قسم کی بات ہے، جو یورپین نژاد پادری اسکاٹ نے کہی تھی یعنی

"یہ مولوی نہیں، صوفی مولوی ہیں۔"

اسی طرح سہارنپور میں بھی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو ڈپٹی انسپکٹر تعلیمات تھے، ان سے ایک اچھے صاحب ذوق ہندو لیکھراج نامی کی ملاقات ہوئی، جو میلے کے بانی منشی پیارے لال کے خاص آشناؤں میں تھے۔ میلے میں وہ بھی شریک تھے، بہرحال لیکھراج نے مولانا ذوالفقار علی صاحب سے کہا تھا کہ

"ایک مولوی صاحب قاسم علی نام اسی طرف کے تھے، ان کا حال کیا بیان کیجئے۔"

پھر جو کچھ دیکھا اور سنا تھا، اس کی تعبیر اپنی خاص اصطلاح میں کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"ان کے (سیدنا الامام الکبیر کے) دل پر تو علم کی سرستی بول رہی تھی۔" صـ ۹۲

یہی سوچنے کی بات ہے، مسلمانوں کے مقابلہ میں پہلی دفعہ ہندوؤں کو اس میلے میں لا کر کھڑا کیا گیا تھا،

لہ مولانا اشتیاق احمد صاحب نے بیان فرمایا کہ مجھ کو میرے والد صاحب (شیخ ظفر احمد صاحب دیوبندی) نے بیان فرمایا کہ اسی زمانے میں جب مباحثہ شاہجہانپور ہوا، شاہجہانپور کے کسی ہندو کا خط مولوی محمد منعم صاحب مظفرنگری وکیل کے پاس آیا۔ اس میں اس مباحثہ کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ایک مولوی جس کا حلیہ یہ تھا، دو پلی ٹوپی اک پٹا پاجامہ، ٹخنے گز کی چال (حضرت نانوتوی) اس نے پادریوں کو ایسا رگید اکہ یہاں کی (ہندوستان کی) ساری قوموں کی لاج رکھ لی۔ یہ خط مولوی محمد منعم صاحب کے پاس سے لایا گیا، اور پڑھا گیا۔ ۱۲ محمد طیب غفرلہٗ

کھڑا کرنے والوں کا جو مطلب بھی ہو، قرآن وقیاسات سے اس سلسلہ میں جن باتوں کا پتہ چل سکتا تھا، تفصیلاً نہیں پیش کر چکا ہوں، لیکن کچھ بھی ہو، اس کی بھلا کون توقع کر سکتا تھا، کہ مسلمانوں کے نمائندے مولوی کو اوتار تک کے درجہ تک پہنچانے والے اسی میلہ میں پیدا ہو جائیں گے، اور سرستی یعنی علم کی دیوی، یا کہئے تو کہہ سکتے ہیں کہ روح القدس کا تائید یافتہ وہی ہندوؤں کو نظر آنے لگے گا۔

اسی سلسلہ میں ایک ہندو جوگی کی داستان کتنی دلچسپ ہے، پہلے سال کے میلہ کا قصہ ہے میلہ جب اکھڑنے لگا، اور واپسی کے وقت مسلمانوں کے اصرار سے بجائے پیادہ پا چلنے کے بہلیاں جن پر شاہ جہاں پورے لوگ آئے تھے، ان ہی میں سے ایک بہلی پر سیدنا الامام الکبیر کو بھی سوار ہونے پر مجبور کیا گیا، اور قطار باندھ کر بہلیاں شہر کی طرف جا رہی تھیں۔ لکھا ہے، کہ میلے سے تھوڑی دور بہلیوں کی یہ قطار پہنچی تھی دیکھا گیا جیسا کہ لکھا ہے

"گاڑیوں کی قطار سے بیس قدم پر ایک جوگی جا رہا تھا، پاؤں میں کھڑاویں، سر پر لمبے لمبے بال، برہنہ سر، ہاتھ میں دست پناہ، دو چار معتقد اس کے ساتھ"

اسی شان سے جوگی جا رہا تھا، کہ اچانک اس بہلی پر اس کی نظر پڑی، جس پر سیدنا الامام الکبیر سوار تھے بیان کیا ہے کہ نظر پڑتے ہی

"مولوی محمد قاسم صاحب کی طرف اشارہ کر کے اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا"

صاحب روداد نے اس کے بعد جوگی کے تلفظ خاص میں اس کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں، یعنی اشارہ کر کے کہہ رہا تھا کہ

"جی مُونبی ہے"

یعنی "یہ مولوی ہے" جوگی کی زبان سے یہ الفاظ نکل ہی رہے تھے، لکھا ہے، کہ

"اتفاقاً مولوی محمد قاسم صاحب کی نظر اُدھر کو پلٹی"

دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں، سامنا ہوتے ہی جوگی ہی نے پیش قدمی کی، اور سیدنا الامام الکبیر کو سلام کیا، جوگی کے اس سلام کی نوعیت کیا تھی، اس کو تو صاحب روداد نے نہیں بیان کیا ہے، لیکن ہندو جوگی

کے سلام کا جواب دارالعلوم دیوبند کے بانی سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے جس طریقہ سے دیا گیا تھا، وہ سننے کے قابل ہے، لکھا ہے کہ

"مولوی محمد قاسم صاحب نے التفات کے ساتھ، ہاتھ اٹھا کر جواب دیا"

اس سے پہلے میلے میں جو کچھ کہا اور کیا جا رہا تھا، اگر سمجھا جائے، کہ ہندوؤں کے مقابلہ میں "مدافعت بالحسنیٰ" والے قرآنی قانون کی تعمیل کی وہ اجتماعی شکل تھی، یعنی اس کا رخ ان عام ہندوؤں کی طرف تھا، جو اس میلے میں شریک تھے، تو قرآن کے اسی حکم کا ایک شخصی اور جزئی تجربہ حضرت والا کے اس طریقہ کار کو ہم شاید قرار دے سکتے ہیں جو اسی ہندو جوگی کے ساتھ اس وقت اختیار کیا گیا، نتیجہ بھی اسی وقت اس شکل میں سامنے آگیا، لکھا ہے کہ

"اس نے (جوگی نے) جو دیکھا کہ مولوی صاحب التفات سے جواب دیتا ہے، تو وہاں سے (یعنی جہاں پر وہ کھڑا ہوا تھا) دوڑا اور گاڑی کا ڈنڈا پکڑ کر گاڑیبان سے کہا "تھام دے"

کانہ ولی حمیم (گویا وہ ایک گرم جوش دوست ہے) نتیجہ کے ان قرآنی الفاظ کی یہ کتنی واضح اور کھلی ہوئی تصویر ہے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں میں مذہب کے معاملہ میں مقابلہ ہوگا، اسی خبر کو سن کر ظاہر ہے، کہ اپنی قوم کی طرف سے گو مقابل بن کر اس میلہ میں یہ جوگی پہنچا تھا، معلوم ہوتا ہے، کہ مسئلہ سے خاص دلچسپی بھی رکھتا تھا، آگے معلوم ہوگا کہ بجائے عام لوگوں کے اسی لئے خیمہ کے اندر اس جوگی کو جگہ دی گئی تھی،

بہرحال دوڑ کر جوگی نے گاڑی ــــ ڈنڈے کو پکڑا، اور "تھام دے" کی اصطلاحی آواز دے کر بہلیوں کی ساری قطار کو رکوا دیا۔ قاعدہ ہے، کہ قطار میں چلنے والی گاڑیوں کے مقدمۃ الجیش کو جب دیہات والے کہتے ہیں کہ "تھام دے" تو وہ خود بھی تھم جاتا ہے، اور پیچھے لگی ہوئی گاڑیوں کو بھی تھم جانے کا حکم دیتا ہے، یہی صورت یہاں پیش آئی۔ اب آگے کیا ہوا، یہ لکھ کر کہ

"القصہ گاڑیاں تھم گئیں"

صاحب روداد نے بیان کیا ہے، کہ اس کے بعد سیدنا الامام الکبیر کو مخاطب بنا کر جوگی نے کہا کہ

مسلم وغیر مسلم باشندوں کی ملی جلی آبادیوں کے رہنے والے مسلمانوں کیلئے پہلے نہیں تو اب جب بادشاہی کا خواب صرف خواب بن چکا ہے، کیا یہ سوچنے کا وقت نہیں آگیا ہے، کہ جس دینی فرض کی حکومت کے جھگڑوں میں مبتلا ہو کر ان کے اگلوں نے لاپروائی برتی تھی، اس فرض کی ذمہ داری کو وہ محسوس کریں، اور سوچیں۔ اس بات کو کہ غیر اسلامی آبادیوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کا ایسا صحیح راستہ کیا ہو سکتا ہے جس پر چل کر دین کا فرض بھی ادا ہوتا رہے، اور دنیا میں دوسری قوموں سے ان کے تعلقات خوش گوار رہیں۔

ظاہر ہے، کہ یہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے۔ بہر حال اس باب میں مسلمانوں کو فیصلہ تک پہنچنا ہی پڑے گا، میں یہی کہنا چاہتا ہوں، کہ دوسری باتوں کے ساتھ چاہا جائے تو روشنی کا مینار سیدنا الامام الکبیر کے ان نمونوں کو بھی بنایا جا سکتا ہے، جنھیں خدا شناسی کے ان میلوں میں آپ کی رفتار و گفتار سیرت و کردار نے پچھلی نسلوں کے لئے چھوڑا ہے۔

آپ دیکھ چکے کہ ان ہی میلہ جس میں اور کچھ نہیں تو کم از کم اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ اسلام اور مسلمانوں کی دینی تحقیر و توہین کا ارادہ کر کے عیسائی مذہب اور ہندو دھرم کے نمائندے شریک ہوئے تھے۔ لیکن میلے میں پہنچنے کے بعد سیدنا الامام الکبیر نے اسلام کے بنیادی حقائق کی تبلیغ کا ذریعہ ان ہی میلوں کو جو بنا لیا تھا، اس باب میں آپ کی سعی و کوشش جن حدود تک پہنچی تھی، اس کی داستان سنا چکا ہوں۔

بلکہ ارواح ثلثہ میں مولانا طیب صاحب کے حوالہ سے یہ روایت جو درج کی گئی ہے کہ ان کے والد ماجد مولنا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ

"جب مباحثہ شاہ جہاں پور ہو چکا، اور حضرت مولانا نانوتوی مظفر و منصور ہو کر واپس تشریف لائے تو مولانا محمد یعقوب صاحب نے فرمایا کہ اب مجھے مولنا کی وفات قریب معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کو ان سے جو کام لینا تھا، وہ پورا ہو چکا۔"

"کام جو لینا تھا" اپنے ان الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مولنا محمد یعقوب یعنی ہمارے

یا شرر باریوں کا سلسلہ شروع کیا تھا، پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں، پنڈت جی اپنی ذہانت کے زور سے اس دعوے کا اعلان کرتے پھرتے تھے کہ دنیا کی تمام بت پرست قوموں میں سب سے بڑی بت پرست قوم مسلمانوں کی ہے۔ بظاہر رڑکی میں بھی اپنی اسی اچھوتی اور انوکھی اپج سے مسلمانوں کے دل و دماغ کو مجروح کر رہے تھے۔ پنڈت جی کے اعتراضوں میں گل سرسبد کی حیثیت اسی اعتراض کو حاصل تھی اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے، کہ رڑکی کے اسی قصے کے سلسلے میں سیدنا الامام الکبیر نے قبلہ نما نامی اپنی کتاب اسی اعتراض کے جواب میں لکھی ہے، بہر حال شعبان میں پنڈت جی کی آمد کی خبر ملی، رڑکی کے مسلمانوں نے تو خیر طلب ہی کیا تھا، لیکن اس بیرونی کشش کے سوا سچ پوچھئے تو خود سیدنا الامام الکبیر بھی رڑکی کی آئی ہوئی خبروں سے تلملا اٹھے تھے، اسی کتاب قبلہ نما کے دیباچہ میں ارقام فرماتے ہیں کہ

"حسب الطلب بعض احباب (رڑکی) اور بتقاضائے غیرتِ اسلام یہ ننگ اسلام بھی شروع شعبان میں وہاں (رڑکی) پہنچا۔" صـ۲

اس میں شک نہیں کہ رڑکی کا فاصلہ زیادہ نہ تھا، لیکن ذرا سوچئے تو سہی ان باتوں کو کہ حجاز کے طول و طویل سفر سے ابھی آپ واپس ہوئے ہیں، اور واپسی بھی ایسی شدید علالت کے ساتھ ہوئی ہے، اگو مرض میں وقتی طور پر گونہ افاقہ کی صورت ظاہر ہو چکی تھی، لیکن ضعف ہی نہیں، بلکہ مصنف امام نے جو اطلاع دی ہے، کہ

"مولانا (سیدنا الامام الکبیر) باوجود ضعف اور مرض کے تشریف لے گئے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ مرض کا لگاؤ بھی باقی تھا۔ مولانا حکیم منصور علی خاں صاحب نے اپنی کتاب مذہب منصور میں رڑکی کے اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے جس کا آگے ذکر آ رہا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ رڑکی کا یہ سفر بہلی میں کیا گیا تھا۔ بیل کی اس گاڑی کے ہچکولوں کر اچھے اچھے تندرستوں کے بھی انجر پنجر ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، پھر مرض اور مرض کی نقاہت کے ساتھ یہ سفر جس حد تک تکلیف دہ ہو سکتا ہے خصوصاً راستہ بھی جب ہموار نہ ہو، قبلہ نما کے

اسی کے ساتھ ان ہی کی یہ بات کتنی صحیح ہے، کہ

"علاوہ بریں اگر فساد ہوتا تو اول مولوی محمد قاسم اور ان کے ہوا خواہ گرفتار ہوتے' پنڈت جی کو

اتنا ہی کافی تھا کہ ہم تو پہلے کہیں تھے"

حقیقت یہ ہے کہ ان باتوں کو جب ہم سوچتے ہیں، تو قسمت کے سوا کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ پنڈت جی سیدنا الامام الکبیر سے مل کر گفتگو اور بات چیت کرنے سے کیوں کتراتے رہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ ملنے کے بعد دونوں کے درمیان کن کن مسائل کا ذکر آ سکتا تھا۔ آخر رڑکی ہی میں دیکھنے والوں نے اسی زمانہ میں جب دیکھا تھا، حکیم الامت تھانوی قدس اللہ سرہ اس روایت کے راوی ہیں کہ رڑکی کا وہی انگریز مجسٹریٹ جس نے حضرت والا کو بلا کر ملاقات کی تھی، اور امن وامان کی ضمانت لی تھی، انیسویں صدی کا ای انگریز نے اس وقت جو انگریزی قوم کے الحاد اور بے دینی کا گویا عہد شباب تھا، اسی نے باتوں باتوں میں سیدنا الامام الکبیر سے

"بارش کی کمی کی وجہ پوچھی"

حضرت تھانویؒ فرماتے تھے کہ جواب میں

"مولانا نے دلائل عقلیہ سے ثابت کر دیا، کہ گناہ سبب ہیں کمی بارش کے"

یہاں تک تو خیر کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر تعجب ہو، لیکن آگے حضرت تھانوی نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

"وہ (یعنی انگریز مجسٹریٹ) بہت ہی محظوظ ہوا، اور مولانا کے علم کا قائل ہو گیا، اور بہت اچھی طرح پیش آیا" قصص الاکابر الہادی ۵۳ھ ماہ جمادی الاولیٰ

ہم جب اس خبر کو پڑھتے ہیں، تو خیال گذرتا ہے، کہ انیسویں صدی میں جب ایک انگریز کو سیدنا الامام الکبیر یہ سمجھا سکتے تھے، کہ بارش کی قلت اور قحط خدا کی نافرمانیوں کا نتیجہ ہے۔ آپ کے علمی احترام کی وجہ آپ کی یہی تقریر بن سکتی تھی، تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ پنڈت جی سے براہ راست گفتگو کرنے کی کوشش میں سیدنا الامام الکبیر اگر کامیاب ہو جاتے تو آپ کے خیالات واحساسات کو پنڈت جی